معاصر نظموں ''نوحہ گر''، ''تمثیل'' اور ''تراش'' کے موضوعات کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

اقراء قمر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۰

معاصر نظموں ''نوحہ گر''، ''تمثیل'' اور ''تراش'' کے موضوعات کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

اقراء قمر

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے ،وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: معاصر نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کے موضوعات کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ

پیش کار: اقراء قمر رجسٹریشن نمبر:1376/M/U/F-17

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان وادب اردو

ڈاکٹر نازیہ یونس _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ _____

اقرار نامہ

میں اقراء قمر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

اقراء قمر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۰ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	II
اقرار نامہ	III
فہرست ابواب	IV
ABSTRACT	VII
اظہار تشکر	IX
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف و اردو میں طویل نظم کی روایت	**۱ تا ۳۱**
الف۔ تمہید	۱
I. موضوع کا تعارف	۱
II. بیان مسئلہ	۲
III. مقاصد تحقیق	۲
IV. تحقیقی سوالات	۲
V. نظری دائرہ کار	۳
VI. تحقیقی طریقہ کار	۳
VII. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیقی کام	۳
VIII. تحدید	۳
IX. پس منظری مطالعہ	۴
X. تحقیق کی اہمیت	۴
ب۔ نظم کا تعارف	۴
ج۔ اردو میں طویل نظم کی روایت	۸
د۔ شاعروں کا تعارف	۱۲
ہ۔ نظموں کا تعارف	۲۴

حوالہ جات ۳۰

باب دوم: تین معاصر نظموں کے ذیلی موضوعات کا تجزیہ ۳۲تا۸۲

الف۔ نظم "نوحہ گر" کے موضوعات کا تجزیہ ۳۳

ب۔ نظم "تمثیل" کے موضوعات کا تجزیہ ۴۸

ج۔ نظم "تراش" کے موضوعات کا تجزیہ ۶۶

حوالہ جات ۷۸

باب سوم: تین معاصر طویل نظموں کے اشتراکات کا جائزہ ۸۳تا۱۰۳

الف۔ تاریخ انسانی ۸۴

ب۔ انسانی تہذیبی سفر ۸۵

ج۔ قبل از آفرینش سے آغاز ۸۷

د۔ انسان کا ظہور ۸۷

ہ۔ امن کی خواہش پر اختتام ۸۸

و۔ قتل وغارت گری ۹۲

ز۔ تدریجی و تاریخی واقعات کا بیان ۹۳

ح۔ تصور خدا ۹۴

ط۔ تصور وقت ۹۵

ی۔ تصور موت ۹۷

ک۔ وجودیت ۹۸

حوالہ جات ۱۰۱

باب چہارم: تین معاصر نظموں کے افتراقات کا جائزہ ۱۰۴تا۱۲۱

الف۔ سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید ۱۰۴

ب۔ نابودیت ۱۰۵

ج۔ تخلیق کائنات ۱۰۷

د۔ اسلوب اور ڈکشن میں فرق ۱۰۸
ہ۔ مورخین پر تنقید ۱۱۱
و۔ مختلف مذاہب کا تذکرہ ۱۱۱
ز۔ تصور زماں و مکاں ۱۱۳
ح۔ نظریہ مخویت ۱۱۴
ط۔ مختلف حوالہ جات کا استعمال ۱۱۵
ی۔ فرد مولا صفات ۱۱۷
ک۔ موقف ۱۱۸
ل۔ اختتامیہ میں فرق ۱۱۹
حوالہ جات ۱۲۰
باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات ۱۲۲تا۱۲۸
الف۔ مجموعی جائزہ ۱۲۲
ب۔ تحقیقی نتائج ۱۲۶
ج۔ سفارشات ۱۲۸
کتابیات ۱۲۹
ضمیمہ جات ۱۳۴

ABSTRACT

TITLE: An analytical and comparative study of the themes of contemporary poems "NOHA GAHR" , "TAMSEEL" and "TARASH"

The **topic** of my MPhil thesis is AN ANALYTICAL AND COMPARATIVE STUDY OF THE THEMES OF CONTEMPORARY POEMS "NOHA GAHR", "TAMSEEL" AND "TARASH". To talk about the topic these three long poems: "NOHA GAHR", "TAMSEEL" AND "TARASH" are contemporary poems. These poems describe the human history. Poems tell of the barbarism and cruelty that man has adopted since ancient times. The scope of urdu poetry is very wide. Many poets have written long poems in urdu literature, but few poets are considered successful poets. Shehzad nayar , khawar ijaz and Akhter usman are considered successful poets in modern times.The purpose of my article is to determine the importance of long poems in modern poetry and the intellectual study of modern poems i.e noha gahr, tamseel and tarash. Poems under study offer new angles of thought. where there are similarities there are also differences. The proposed research topic is to analyze the commonalities and differences between the contemporary poems by analyzing them. In modern long poems we discover the concept of history, time and the concept of man. Poems will be relied upon in the article under review. Research includes interviews, seminars, research journals and as well as study of research and critical books. Primary and secondary sources will be used in research methodology. Innovation, rare narrative, metaphorical examples and scientific topics are proof that under review long poems excellent in urdu literature.This thesis has been divided into five chapters whose detail is as under:

First chapter titled "Tradition of long poem in Urdu". This chapter explains the introductory of poems, poets, basic discussion, and tradition of long poem.

Second chapter titled "Analysis of the sub themes of the three contemporary poems". This chapter presents the thematic analysis of three long poems "NOHA GAHR" , "TAMSEEL" and "TARASH".

Third chapter titled "An overview of similarities of three contemporary long poems". Here the introduction to this comparison has been presented and the similarities between three poems have also been thrown light upon.

Fourth chapter titled "An overview of differences of three contemporary long poems". This chapter portrays the difference between poems.

Fifth chapter is about the overall view of the poems under discussion. At the end of the chapter the results of the research and further recommendations have been explained.

اظہار تشکر

میں مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے اس پاک رب کی ذات کی شکر گزار ہوں جو حیات و کائنات کے تمام علمی و فکری سر چشموں کا مالک ہے۔ جس نے مجھے تحقیق جیسے محنت طلب کام کو سر انجام دینے کے لیے ہمت اور جرات بخشی۔ مقالے کی تکمیل میں میری نگران ڈاکٹر نازیہ یونس خصوصی شکریے کی مستحق ہیں انہوں نے مقالے کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ مجھے قیمتی آراء سے مستفید فرمایا اور ہر قدم پر میری راہنمائی بھی کی۔ میں شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ کی بھی ممنون ہوں جن سے میں نے ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ میں اپنے والدین کی بے حد ممنون ہوں جن کی دعاؤں اور شفقت کی بدولت میرا مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ میں محترم شہزاد نیئر، خاور اعجاز اور اختر عثمان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے بے پناہ مصروفیات کے باوجود اپنا قیمتی وقت مجھے دیا۔ انہوں نے مواد کی فراہمی اور مقالے کی تکمیل میں مجھے معاونت اور مشاورت سے نوازا۔ اس موقع پر میں اپنی دوستوں اور معاونت کرنے والوں کو نہیں بھول سکتی جنہوں نے مجھے احساس دلایا کہ مصروفیات تو یونہی چلتی رہیں گی مگر آپ مقالے کے کام میں تاخیر مت کرو۔ ان سب دوستوں کے خلوص کے لیے میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میرے دل میں ان کے لیے موجود احساسات کو چند الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

اقراء قمر

ایم فل اردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف و اردو میں طویل نظم کی روایت

الف: تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف:

میرے ایم۔فل کے مقالے کا مجوزہ موضوع "معاصر نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کے موضوعات کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ" ہے۔ یہ موضوع تین خاص نظموں "نوحہ گر" از شہزاد نئیر، "تمثیل" از خاور اعجاز اور "تراش" اختر عثمان کے حوالے سے ہے۔ "نوحہ گر" کی اولین طباعت ۲۰۱۰ء، تمثیل ۲۰۱۵ء اور تراش ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی۔ نظم اطالوی زبان کا لفظ ہے۔ اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں تسلسل موجود ہو نظم کہلاتا ہے۔ اردو ادب میں طویل نظمیں تو کافی تعداد میں لکھی گئی ہیں مختلف ادوار میں ان طویل نظموں سے اردو ادب کے قاری روشناس و مستفید ہوتے رہے۔ مگر مقبولیت چند ایک کے حصے میں آئی۔ جن میں ن۔م راشد، اور وزیر آغا کا نام قابل ذکر ہے۔

اپنے وسائل اور مسائل کے باوصف نئی نظم آج اصناف شاعری میں ایک ممتاز اور مستند مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس لیے تقریباً سبھی نو واردانِ شاعری نے نظم کو وسیلہ اظہار بنایا، شہزاد نئیر، خاور اعجاز اور اختر عثمان کا شمار ان جدید شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے طویل نظمیں لکھ کر اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے یہ تینوں شاعر بطور نظم گو، نظم کے مکمل لوازمات سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ اُن کو بروئے کار لاتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انہیں ترقی پسند سماجی فکر اور شعری فن دونوں کے جدید تقاضوں اور معیاروں سے بھی خاطر خواہ اگاہی حاصل ہے۔

نظم میں سب سے اہم چیز مضمون اور نفس مضمون کا ارتباط ہے اس کے بعد بات سے نئی بات نکالنے کا فن اور مصرعہ در مصرعہ نظم کی تعمیر ان تمام خصائص کے عملی مظاہرے ان طویل نظموں میں بام عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ زیر تحقیق نظمیں "نوحہ گر"، "تمثیل"، اور "تراش" دور جدید میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ان میں تصورات کی تازگی، موضوعات کی رنگا رنگی اور اظہار کی ندرت نمایاں ہے یہ سوچ کے نئے زاویوں کو پیش کرتی ہیں ان تین طویل نظموں میں جہاں

مماثلت نظر آتی ہے وہاں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ نظمیں جدید دور کی کامیاب نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔

۲۔ بیان مسئلہ:

اردو ادب میں شہزاد نئیر، خاور اعجاز اور اختر عثمان کا شمار جدید دور کے کامیاب نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔ میرا تحقیقی کام ان تین شاعروں کی نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل"، اور "تراش" کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ کرنا ہے۔ ان نظموں کا تجزیہ کر کے ان میں اشتراکات اور افتراقات کا جائزہ لینا ہے۔ عصر حاضر کی طویل نظموں کے افکار اور فن پر بحث کی جائے گی۔ تحقیق کر کے یہ بھی جائزہ لیا جائے گا کہ کیا ان نظم نگاروں نے ایک دوسرے کی تقلید کی ہے یا کیا یہ ایک دوسرے سے متاثر تھے۔ ان نظم گو شاعروں نے اردو ادب میں کون سے جدتیں پیدا کی ہیں۔

۳۔ مقاصد تحقیق:

مجوزہ تحقیقی موضوع کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

i۔ جدید نظم نگاری میں طویل نظم کی اہمیت کا تعین کرنا

ii۔ جدید نظموں کا اسلوبی اور فکری مطالعہ کرنا

iii۔ جدید طویل نظموں میں تصور تاریخ، تصور وقت اور تصور انسان کی دریافت کرنا

iv۔ طویل نظموں میں اشتراکات اور افتراکات کا جائزہ لینا

۴۔ تحقیقی سوالات:

مجوزہ تحقیقی موضوع "معاصر نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کے موضوعات کا تجزیاتی و تقابلی مطالعہ" کے لیے درج ذیل تحقیقی سوالات سامنے رکھے جائیں گے۔

i۔ اردو ادب میں ان تین طویل نظموں کی کیا اہمیت ہے؟

ii۔ ان تین نظموں میں کون سے اشتراکات اور افتراقات ہیں؟

iii۔ زیر تحقیق نظم گو شاعروں نے ایک دوسرے کی تقلید تو نہیں کی ہے؟

iv۔ زیر تحقیق نظم گو شاعروں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے یا نہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

مجوزہ تحقیقی موضوع "معاصر نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کے موضوعات کا تجزیاتی و تقابلی مطالعہ" کے پیش نظر ان نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کر کے ان میں اشتر کات اور افتر اقات کا جائزہ لینا ہے۔ تین معاصر نظموں میں جو اشتر اکات اور افتر اقات ہیں مثلاً تاریخ انسانی، انسانی تہذیبی سفر، نوحہ گری، تدریجی و تاریخی واقعات، تصور خدا، تصور موت، تصور وجودیت، تصور زماں و مکاں، تصور مخویت، نظریہ نابودیت، موقف، تخلیق کائنات، کردار نگاری، تھوریز کا تذکرہ، فرد مولا صفات، انسان کا ظہور اور مختلف حوالہ جات کا استعمال وغیرہ پر مجوزہ تحقیق میں بحث کی جائے گی۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیر نظر مقالے میں "نوحہ گر" از شہزاد نئیر، "تمثیل" از خاور اعجاز اور "تراش" اختر عثمان پر انحصار کیا جائے گا۔ دستاویزی اور بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی ماخذات سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ بنیادی ماخذات کو بذریعہ ڈاک حاصل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان تین شاعروں سے اور ان کے احباب اور دیگر شاعروں سے انٹرویو کو بھی شامل تحقیق کیا جائے گا۔ انٹرویو، کانفرنسز، سیمینار، تحقیقی رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی شامل تحقیق ہے۔ مزید رسائل و جرائد اور کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا جائے گا۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیقی کام:

شہزاد نئیر، خاور اعجاز اور اختر عثمان کے کلام پر مختلف جامعات میں ایم۔اے، ایم۔فل، کی سطح پر تحقیقی کام ہو چکا ہے لیکن تاحال کسی بھی جامعہ میں مجوزہ موضوع "معاصر نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کے موضوعات کا تجزیاتی و تقابلی مطالعہ" پر ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی سطح پر کسی قسم کا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا مجوزہ موضوع ادبی سطح پر تحقیق کے حامل ہے۔

۸۔ تحدید:

عصر حاضر میں جدید اردو نظم نگاروں میں شعراء کی کہکشاں نظر آتی ہے۔ ان تمام شعراء کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے میں نے تین جدید معاصر شاعروں شہزاد نئیر، خاور اعجاز اور اختر عثمان کا انتخاب کیا ہے۔ ان شاعروں کا کلام بہت زیادہ ہے اور کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ میں نے ان کی وہ طویل نظمیں منتخب کی ہیں جو

ایک خاص موضوع پر ہیں۔ ان تین طویل نظموں "نوحہ گر" از شہزاد نئیر، "تمثیل" از خاور اعجاز اور "تراش" اختر عثمان شامل ہیں۔ ان نظموں میں جہاں اشتراکات نظر آتے ہیں وہاں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

اردو شاعری میں طویل نظم کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ علامہ اقبال کے ہاں بھی ہمیں طویل نظمیں بہت سی نظر آتی ہیں اور ان پر تحقیقی کام ہوا بھی ہے۔ محققین نے نظموں کو کڑے معیار پر رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اعلیٰ پائے کا کام کیا ہے۔ ان کی کتب میں "نظم جدید کی کروٹیں" اور "اردو شاعری کا مزاج" نظم پر اعلیٰ پائے کے تحقیقی کام ہیں جن سے راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جدید نظم کی روایت پر سرور جاوید کا کام بھی قابل داد ہے۔ جدید شاعری پر عزیز حامد مدنی کے کام سے بھی رہنمائی لی جا سکتی ہے۔ اس طرح ایسا کام کافی تعداد میں ہوا ہے جس کو ذہن میں رکھ کر اپنے کام کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

اردو شاعری کا دامن بہت وسیع ہے۔ اردو ادب میں بہت سے شاعروں نے طویل نظمیں لکھیں مگر کامیاب نظم نگاروں میں بہت کم شاعروں کا شمار ہوتا ہے۔ جدید دور میں شہزاد نئیر، خاور اعجاز اور اختر عثمان کا شمار کامیاب نظم نگاروں ہوتا ہے۔ زیر تحقیق نظمیں "نوحہ گر"، "تمثیل"، اور "تراش" جدت طرازی، ندرت بیانی، استعاراتی مثالیں اور سائنسی موضوعات کی بدولت اردو ادب میں عمدہ طویل نظمیں ہونے کا ثبوت ہیں۔ ان نظموں میں اشراکات اور افتراقات بھی پائے جاتے ہیں، جن کا اس موضوع کے اندر احاطہ کیا جائے گا۔

ب: نظم کا تعارف

نظم اطالوی زبان کا لفظ ہے جسے انگریزی میں پولیم کہتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے نظم کے معنی آراستہ کرنے کے ہیں۔ نظم وہ صنف سخن ہے جس میں ایک ہی خیال کو بیان کیا جاتا ہے لیکن اس میں ردیف اور قافیہ کی باقاعدہ پابندی ہوتی ہے۔ شاعر زندگی میں پیش آنے والے واقعات میں سے کسی ایک واقعے کے تمام پہلوؤں کو غور سے دیکھتا ہے پھر ان تمام پہلوؤں کو نظم کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ بقول قاضی عبدالقدوس:

> "نظم کے لغوی معنی ہیں موتیوں کو دھاگے میں پرونا چونکہ نظم میں الفاظ بھی موتیوں کی طرح پروئے جاتے ہیں اس لئے اس کا یہ نام پڑا لیکن شاعری کی اصطلاح میں نظم

اس کلام موزوں کو کہتے ہیں جو باوزن ہو، ردیف و قافیہ سے مزین ہو اور اور بلا ارادہ کہا جائے۔"(۱)

نظم کا عنوان ضرور ہوتا ہے۔ نظم کی خصوصیت میں سے ایک خصوصیت اس کا موضوعاتی ہونا ہے۔ نظم کے تمام اشعار اپنے موضوع سے ربط بر قرار رکھتے ہیں۔ اس میں اشعار کی تعداد کی پابندی نہیں ہوتی۔ نظم کی صنف بنیادی طور پر کسی خاص جذبے کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ یہ فکر اور جذبے کی تہہ در تہہ کیفیات کو سامنے لاتی ہے۔ نظم دراصل فرد کی انفرادیت کی غماز ہوتی ہے اس میں فرد اپنے ذہنی سفر کی داستان بیان کرتا ہے مجموعی طور پر نظم فرد اور اس کے باطن کی ایک کہانی ہے۔بقول مجنوں گورکھپوری:

"نظم دراصل وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہے جس میں بالیدگی ہو، ابتدا ہو، وسعت ہو اور انتہا ہو اور ہر جز اس طرح کل میں ختم ہو جائے کہ کہیں سے جھول معلوم نہ ہو۔۔ نظم کے پہلے مصرعے سے ہمیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ جیسے لپٹی ہوئی چیز کو کھولا جارہا ہے۔ بغیر بالیدگی اور ارتقا کے نظم، نظم نہیں۔"(۲)

نظم میں خارجیت اور داخلیت کا خوبصورت ملاپ ہے۔ اس کے لیے موضوع اور ہئیت کی کوئی قید نہیں۔ نظم میں تاثر کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا ہر مصرعہ اپنی مجرد حیثیت سے محروم محض ایک مرکزی خیال کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔

کولرج بائیو گرافیالٹریریا میں نظم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"اگر ایک حقیقی نظم کی تعریف درکار ہے تو میرا جواب یہ ہوگا کہ وہ نظم لازمی طور پر ایسی ہو، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو باہمی طور پر آگے بڑھا رہا ہوں اور ایک دوسرے حصے کی وضاحت کر رہا ہوں اور سارے حصے اپنے تناسب کے اعتبار سے ہم آہنگ ہوں۔"(۳)

اردو شعراء اور ناقدین نے کالرج کے ان حالات و نظریات سے استفادہ کیا۔ جدید نظم کی صنف اردو میں مغرب سے آئی۔ نظم کا لفظ مختلف ادوار میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ تمام اصناف شاعری نظم کے زمرے میں آتی ہے۔ جس طرح نظم کے موضوعات لا محدود ہیں اسی طرح اس کی شکلیں بھی بے شمار ہیں۔ ہیت کے لحاظ سے مثنوی، مسمط، ترکیب بند، ترجیع بند، مثمن، مخمس، مربع اور مثلث وغیرہ جبکہ

موضوع کے اعتبار سے اصناف نظم میں غزل، قصیدہ اور مرثیہ شامل ہیں۔ با اعتبار ہیت نظم جدید کی متعدد شکلیں ہیں جن میں پابند نظم، معری نظم، آزاد نظم، سانیٹ، نثری نظم، ترائیلے اور ہائیکو وغیرہ شامل ہیں۔

پابند نظم:

پابند نظم کے لیے بحر وزن اور قافیہ وردیف کی پابندی ضروری ہے اس میں کسی ایک خیال کو موضوع بناکر مسدس، مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند اور ترجیع بند کی ہئیت میں بیان کیا جاتا ہے۔ رفیع الدین ہاشمی پابند نظم کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> "پابند نظم کسی بھی موضوع پر کس بھی ہیت (یعنی مثنوی، قصیدہ، مسدس، مربع یا پھر ترکیب بند وغیرہ) میں لکھی جاسکتی ہے۔ عموماً کسی ایک خیال یا تصور کو موضوع نظم بنایا جاتا ہے یعنی نظم کے لیے صرف تسلسل خیال ضروری ہے۔"(۴)

معریٰ نظم:

معریٰ نظم یا بلینک ورس ایسی نظم ہوتی ہے جس میں باقاعدہ وزن اور بحر کی پابندی کی جاتی ہے لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی لازم نہیں ہوتی۔ یہ انگریزی سے اردو میں آئی ہے اسے غیر مقفیٰ نظم بھی کہتے ہیں۔ اردو ادب میں عبدالحلیم شرر نے معریٰ نظم کے ابتدائی تجربات کیے پھر اسمعیل میرٹھی اور دور جدید میں مجید امجدؔ، شکیب جلالی، احمد ندیم قاسمیؔ اور مختارؔ صدیقی قابل ذکر ہیں۔ ابواللّیث صدّیقی معری نظم کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "تکنیک کے لحاظ سے پہلے ترقی پسندوں میں عبدالحلیم شررؔ اور اسمعیل میرٹھی کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ ان دونوں نے اردو میں پہلی مرتبہ غیر مقفیٰ نظم لکھنے کی کوشش کی۔"(۵)

آزاد نظم:

آزاد نظم یا فری ورس دراصل فرانس کی ایک شعری ہئیت ہے۔ انگریزی سے اردو میں داخل ہوکر کر بہت مقبول ہوئی اس میں ردیف اور قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔ آزاد نظم میں ارکان کی پابندی لازم ہے شاعر ایک مصرعے میں جتنے چاہے ارکان استعمال کر سکتا ہے۔ اردو ادب میں ن م راشد اور تصدق حسین خالد کو آزاد نظم کا بانی کہا جاتا ہے دور جدید میں اختر عثمان، شہزاد نیر اور خاور اعجاز کا شمار بھی آزاد نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔

رفیع الدین ہاشمی آزاد نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بے قافیہ نظم میں مصرے یکساں ہوتے ہیں مگر آزاد نظم میں مصرعوں کا برابر ہونا ضروری نہیں۔ آزاد نظم کی بنیاد ایک ہی بحر پر ہوتی ہے مگر بحر کے ارکان کے تقسیم شاعر کی صوابدید پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک رکن دو مصروں میں منقسم ہو جاتا ہے کوئی مصرع چھوٹا اور کوئی بڑا۔"(۶)

سانیٹ:

یہ دور جدید کی پیداوار ہے اور انگریزی شاعری کی قسم ہے۔ سانیٹ کسی بھی بحر اور وزن میں لکھی جا سکتی ہے۔ یہ مقفیٰ نظم ہے جس میں کل چودہ مصرعے ہوتے ہیں۔ اس میں قوافی ایک مقررہ ترتیب سے لائے جاتے ہیں۔ سانیٹ کا پہلا حصہ آٹھ مصروں اور دوسرا چھ مصروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں کسی خیال اور جذبے کو پیش کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں ن م راشد، اختر شیرانی اور بعض دوسرے جدید شعرا نے سانیٹ کو رواج دینے کی کوشش کی مگر یہ صنف اردو میں فروغ نہ پا سکی اور مغرب میں بہت مقبول ہوئی۔

نثری نظم:

ہماری شاعری میں نثری نظم مغرب کے راستے داخل ہوئی لیکن کوئی مقام نہ پا سکی۔ اس میں نہ وزن ہوتا ہے نہ قافیہ نثری نظم میں شعری جذبات کو شدت کے ساتھ پیش کر دیا جاتا ہے۔

ترائیلے:

ترائیلے آٹھ حصوں پر مشتمل نظم ہے۔ فرانسیسی شاعری میں اس کا رواج زیادہ رہا لیکن اردو شاعری میں مقبول نہ ہو سکی۔

ہائیکو:

ہائیکو دو تین مصروں پر مشتمل مختصر نظم ہے۔ یہ قافیہ کی قید سے آزاد ہے اور تینوں مصروں کا وزن بھی الگ ہوتا ہے۔ ہائیکو جاپان سے مغرب میں اور پھر مغرب سے ہمارے ہاں آئی۔ دور جدید میں خاور اعجاز کا نام ہائیکو میں نمایاں ہے۔

ج: اردو میں طویل نظم کی روایت

طویل نظم سے مراد ایسی نظم ہے جس میں ایک عنوان مختصر نظم ہی کی طرح دیا گیا ہوتا ہے اور اس نظم کو بہت سے اشعار اور بندوں میں بہت سے صفات پر تحریر کیا جاتا ہے۔ آمد نظم سے یوں لگا جیسے تخلیق اپنے اصل رنگ میں زندگی جینا سیکھ گئی ہو۔ جہاں نظم کہنا ایک مکمل کیفیت اور رجحان کا نام ہے جو فن پر دسترس مشاہدہ مطالعہ، احساس قلبی وباطنی اور دوراندیشی کو وسعت کے بغیر ناممکن ہے وہاں طویل نظم کہنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ایڈگر ایلن پو کے خیال میں "ہم جس چیز کو طویل نظم کہتے ہیں وہ دراصل مختلف نظموں کا سلسلہ ہوتا ہے یعنی مختصر شاعرانہ تاثرات کا۔"(۷) دیگر زبانوں میں طویل نظم کی الگ اور طویل تاریخ ہے۔ اردو جن علاقوں میں لکھی پڑھی جاتی ہے وہاں کی مقامی زبانوں کے نسبت اردو کی طویل نظموں کی تاریخ ماضی قریب سے شروع ہوتی ہے۔ شعری تجربہ تہہ در تہہ ہوتا ہے اس کی کئی سطحیں ہوتی ہیں اگر ایک سطح سامنے آئے تو نظم تخلیق ہوتی ہے۔ طویل نظم میں وہ ساری سطوح سمٹ آتی ہیں۔

نسیم عبدالمجید طویل نظم کی تعریف یوں کرتے ہیں

> "طویل نظم سے مراد ایسی نظم ہے جو اوسط درجے کی ضخامت سے بھی آگے بڑھ جائے جس کو شاعر نے فنی مہارت سے پھیلا دیا ہو۔ نظم کی جہت باہر سے اندر کی طرف ہے۔ نظم اس مکمل شخصیت کا اظہار ہے جو قوت اور تازگی حاصل کرنے کے لیے غوطہ لگانے کے لیے مجبور کرتی ہے اور اس لیے اس کی جہت باہر سے اندر کی طرف ہے۔"(۸)

نظم نگاری ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے ۱۸۷۴ میں انجمن پنجاب کے مشاعروں سے وجود میں آئی۔ انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم سے جدید اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ ان کی کوششوں سے لے کر علامہ اقبال کے کلام تک اردو نظم نگاری مختلف حالات وواقعات سے گزری۔ قیام پاکستان کے بعد نظم کو فروغ دینے میں ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور لسانی تشکیلات کی تحریک نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو نظم کی دو جہتیں ہیں پہلی جہت میں آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اسمعیل میرٹھیؔ، اکبر الہ آبادی اور محمد دین تاثیر شامل ہیں انہوں نے قومی اور ملی نظمیں لکھیں۔ دوسری جہت میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اوراحسان دانش شامل ہیں۔ یہ جہت پہلی جہت کا رد عمل تھی انہوں نے رومانوی نظمیں لکھیں لیکن علامہ اقبال نے ان دونوں جہات کی درمیانی کڑی کو اپنایا۔ اقبالؔ نے نظم کو خارجی زندگی کے بیان کے علاوہ داخلی زندگی کی عکاسی

کے لیے استعمال کیا۔ ۱۹۳۵ میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے گرد و پیش کو اپنے لپیٹ میں لے کر خارجی زندگی کا عمل تیز کر دیا۔ سامراج، جاگیر داری اور سرمایہ داری نے انسان کو جن مسائل کا امیر بنایا تھا ان مسائل کا ذکر انسان کے نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کا ذکر ترقی پسند شعرا کی نظموں نظر آتا ہے جن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، احمد فراز، افتخار عارف اور فہمیدہ ریاض شامل ہیں۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> "ترقی پسند شاعری میں زندگی کے خارج کو موضوع بنانے اور قاری کو براہ راست مخاطب کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔ اس تحریک نے زندگی کی حریت کو طنز کا نشانہ بنایا اور شاعر کو اس کے خلاف اونچی آواز میں احتجاج کرنے کی دعوت دی۔"(۹)

حلقہ ارباب ذوق ترقی پسند تحریک کے رد عمل کے طور پر سامنے آئی یہ دونوں تحریکیں ایک ہی زمانے میں پروان چڑھی اور رومانوی تحریک کے بطن سے پھوٹی تھیں۔ حلقہ باب ذوق دو شاخوں ادبی اور سیاسی تحریک میں تقسیم ہوئی، سیاسی تحریک جلد دم توڑ گئی جبکہ ادبی تحریک راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد اور دیگر شہروں میں قائم ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے شعراء کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت امتزاج اور توازن ملتا ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر نظم نگاروں میں میراجی اور ن م راشد شامل ہیں تصدق خسین خالد نے پرانی ہیت کو رد کر کے آزاد نظم کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر رشید امجد اپنی کتاب پاکستانی ادب میں لکھتے ہیں:

> "حلقہ ارباب ذوق اگرچہ باقاعدہ تحریک نہ تھی لیکن اب رجحان اور رویے کے طور پر اس کے اثرات بھی گہرے ہیں اور اس حلقے کو ترقی پسند تحریک کا رد عمل سمجھا گیا۔"(۱۰)

قیام پاکستان سے قبل اردو نظم ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۸ میں ایوب خان کے مارشل لاء نے بہت گہرا اثر ڈالا لوگوں کی زندگی نے ایک ایسا رخ اختیار کر لیا جو اردو نظم میں مایوسی اور احساس آزادی کی نفی کرتا ہوا نظر آیا۔ اس دور میں اظہار پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۹۵۸ کے انقلاب نے عدم و تحفظ، جبر و تشدد، زبان بندی اور خوف کے مسئلے کو جنم دیا۔ شاعری الفاظ کا گورکھ دھندہ بن گئی یہی وجہ ہے کہ

قیام پاکستان کے بعد کی نظم میں نمایاں موضوع فسادات تھا۔ اس دور کی نظموں میں مایوسی، زمانے کے انتشار، حالات کی ابتری، فسادات اور شکستگی کے عناصر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

ساٹھ کی دہائی میں نئی شاعری کی تحریک منظم ہونا شروع ہوئی جسے لسانی تشکیلات کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس تحریک سے وابستہ شاعروں جیلانی کامران، افتخار جالب اور سلیم الرحمان نے اپنی نظموں میں زبان کو روایتی انداز سے ہٹ کر استعمال کیا انہوں نے موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اردو نظم میں نئی لفظیات، تمثالوں اور داخلی آہنگ کے سانچوں کا اضافہ کیا۔ جیلانی کامران اور افتخار جالب لسانی تشکیلات کے اولین لمبر داروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لسانی تشکیلات کا نظریہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ یہ تحریک جوش وخروش سے اٹھی تھی لیکن ۱۹۶۵ کے بعد جب ملک کا سیاسی منظر نامہ بدل گیا تو لسانی تشکیلات کی تحریک حالات کے سیل رواں میں گم ہو گئی اور جلد ہی ناکام ہو گئی۔

رشید امجد اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

> "ہماری قومی زندگی کو ایک ہزار سال کا فکری زوال ورثے میں ملا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم نے اپنی قومی زندگی میں سوالوں کا انتخاب کیا اور نہ نظم میں۔۔۔ نئی نظم کے سفر میں تین بڑے سیاسی موڑ ہیں۔ ۱۹۵۷ کا انقلاب ۱۹۶۸ کی عوامی تحریک اور ۱۹۷۱ میں المیہ مشرقی پاکستان۔"(۱۱)

ستر کے بعد اردو نظم نے ایک اور کروٹ بدلی۔ نئی وطنی صورت حال اور سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے شاعروں نے حب الوطنی کے جذبات سے لبریز نظمیں لکھیں۔ اسی کی دہائی میں اردو نظم میں جمود نظر آتا ہے۔ اس دہائی کے شعراء نے نظم کو وسیع موضوعات سے نوازا۔ ان شاعروں نے جلد ہی نظم میں اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا۔

طویل نظموں کی بات کی جائے تو اردو کی طویل نظم سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور فطری ضرورت کے تحت وجود سے عالم وجود میں آئی۔ اردو کی طویل نظم کا مزاج اردو کی مختلف اصناف سخن کے خمیر سے بنا ہے لیکن اس کے باوجود ایک منفرد صنف سخن ہے اس کا تخلیقی مزاج جداگانہ ہے۔ اردو کی طویل نظم پر مرثیہ اور مثنوی کی گہری چھاپ ہے۔ یہ طویل نظم مادی حالات اور فطری ضروریات کی دین ہے۔ یہ تدریجی طور پر ارتقائی عمل کی مختلف منزلوں سے گزرتی رہی۔ بقول شمس الرحمان فاروقی:

"طویل نظم کے دو طرح کے جواز ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ آپ کے پاس کوئی Narative theme ہے کوئی بیانیہ کوئی کہانی کوئی واقعہ جیسے سحر البیان دوسرا یہ ہو سکتا ہے کوئی شخصیت ایسے theme کا اظہار کرنا چاہیے جو Meditative ہو جس میں حیات و کائنات کے کسی ایک بڑے مسئلہ یا ذات کائنات کے بڑے مسائل پر اظہار کرنا مقصود ہو Meditative tone میں۔"(۱۲)

اردو ادب میں طویل نظم کی دنیا سمٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو ادب میں طویل نظمیں بہت کم تعداد میں ملتی ہیں اگر یوں کہا جائے کہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے مگر جتنی بھی طویل نظمیں آزادی کے بعد منظر عام پر ان کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے بڑا ترقی پسند شعرا اور کلاسیکیت وروایت کا احترام کرنے والے شعراء کی منظومات کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ ساحر لدھیانوی ترقی پسند شعرا میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ ان کی طویل نظم "پرچھائیاں" بلند پایہ کی نظم ہے اس طرح جان نثار اختر کی طویل نظمیں "امن نامہ"، "دانائے راز"، "ریاست" ، "ستاروں کی صدا" اور "آخری لمحہ"، جگن ناتھ آزاد کی طویل نظموں میں "میرا موضوع سخن"، "وطن میں اجنبی"، "ماتم نہرد"، حامد اللہ افسر کی دو طویل نظمیں "رزم آخر" اور "آدمی نامہ" عمیق حنفی کی طویل نظموں میں "سازگان"، "ویت نامہ"، "صوت الناقوس"، "سفر آگ"، وحید اختر کی طویل نظموں میں "صحرائے سکوت" اور ابن انشاء کی طویل نظموں میں "مضافات" اور "دیوانے کا پاؤں" شامل ہیں۔ فیض کے ہاں پابند شاعری کا تناسب زیادہ رہا اور یہ نظم معری کے زیادہ قریب رہے۔ فیض نے "صبح آزادی"، "زنداں کی ایک شام"، "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" اور اقبال نے "ساقی نامہ"، "خضر راہ"، "مسجد قرطبہ" اور "ذوق و شوق" وغیرہ جیسی طویل نظمیں لکھ کر اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔

اردو ادب میں طویل نظم نگاری کا میلان عہد حاضر میں بھی پایا جاتا ہے اور شعراء اس سمت میں متوجہ ہیں۔ اردو طویل نظم نگاروں میں ن م راشد کی نظم "حسن کوزہ گر"، وزیر آغا کی "ٹرمینس"، "الاؤ"، "اک کتھا انوکھی"، جیلانی کامران کی "باغ دینا"، ساقی فاروقی کی "یاد کی شاخ"، "گھنی تسلی"، اختر حسین جعفری کی "آئینہ خانہ"، نصیر احمد ناصر کی "چندھا"، "لائٹ ہاؤس"، "لائٹ کوئز"، وحید احمد کی "مرمت کون کرتا ہے"، جاوید انور کی "اشکوں کی دھند"، عرش صدیقی کی "محبت لفظ تھا میرا"، آفتاب اقبال شمیم کی "زمانہ بازار بن گیا" اور علی محمد فرشی کی "علینہ" شامل ہیں۔ اردو ادب میں طویل نظمیں لکھنے والے نئے شعراء میں ارشد

معراج، روش ندیم، فاخرہ بتول، خلیق الرحمان، سعید احمد دوشی، خاور اعجاز، اختر عثمان اور شہزاد نیئر وغیرہ شامل ہیں۔ زیر تحقیق نظمیں "تمثیل" از خاور اعجاز، "تراش" از اختر عثمان اور "نوحہ گر" از شہزاد نیر اعلی پائے کی طویل نظمیں ہیں۔ نظم کو عہد بہ عہد فروغ حاصل ہوتا رہا لیکن پھر بھی نظم نگار قنوطیت کا شکار نہیں بلکہ زندگی کی حسین قدروں کی تخلیق اور بازیابی کے لیے بہترین صلاحیتوں سے کام لے رہے ہیں۔ ان شاعروں نے بھی اعلیٰ نظمیں لکھ کر نہ صرف قاری کو حیرت میں ڈال دیا بلکہ نظم کے فنی لوازمات کا بھرپور خیال رکھا۔

د: شاعروں کا تعارف

1۔ خاور اعجاز:

موجودہ دور میں اردو شاعری میں بطور حمد و نعت نگار، غزل و نظم گو، رباعی و قطعہ نویس، محقق، تنقید نگار، کالم نگار، ہائیکو نگار، تذکرہ نویس، مزاح نگار، نظم و نثر اور مترجم ایک خاص نام خاور اعجاز کا ہے۔ یہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں انہوں نے نظمیں بھی لکھیں جو جدت خیال وافکار کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہیں۔ خاور اعجاز زندگی کے بدلتے رویوں کا شعور رکھتے ہیں اور ان کی شاعری اپنے اندر سحر انگیز شخصیت لیے ہوئے ہے۔

خاور اعجاز کے دادا خوشی محمد پیشے کے لحاظ سے صنعتکار تھے۔ ان کے والد غوث محمد خوشی محمد کی اکلوتی اولاد تھے جب خوشی محمد کا انتقال ہوا تو غوث محمد کے نانا ان کے سرکاری طور پر گارڈین مقرر ہوئے۔ خاور اعجاز کے خاندان میں مذہبی رجحانات کے علاوہ ادبی رجحان بھی ملتا ہے۔ آپ کے نانا کے صوفی تبسم اور فیض احمد فیض سے اچھے تعلقات تھے۔ غوث محمد اپنی والدہ کے ہمراہ ۱۹۴۷ میں امرتسر سے ہجرت کر کے پہلے لاہور اور پھر راولپنڈی آئے۔ انہوں نے پہلے ریلوے میں ملازمت کی پھر ملٹری اکاونٹس میں آگئے۔ اور یہیں سے اسسٹنٹ کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لی۔ خاور اعجاز ۲۴ ستمبر ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن پنڈی کے محلے شاہ چن چراغ میں گزرا۔ خاور اعجاز بچپن میں کھیل کود، شرارتوں اور کھانے میں دلچسپی لیتے تھے۔ پتنگ بازی کا بہت شوق تھا اسکول میں نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔

خاور اعجاز نے ابتدائی تعلیم کا آغاز محلے کے اسکول سے کیا لیکن جلد ہی انگلش میڈیم soloman standard اسکول میں داخل ہو گئے۔ پانچویں جماعت تک اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد چھٹی جماعت میں مشن ہائی سکول میں حصہ لیا۔ مشن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان ۱۹۶۶ میں اول درجے میں پاس کیا ۱۹۶۸ میں گارڈن کالج راولپنڈی سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اسی کالج سے ۱۹۷۰ میں بی ایس سی کا امتحان اضافی مضمون فارسی کے ساتھ پاس کیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ ڈگری کالج اصغر مال میں ایم ایس سی کے لئے داخلہ لے لیا۔ آپ نے ایم ایس سی کا امتحان ۱۹۷۳ میں پاس کیا۔ یہاں Mathematical Association کے سیکرٹری بھی رہے۔

۱۹۷۳ میں خاور اعجاز نے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ انہوں نے اسلام آباد سیکرٹریٹ میں ڈی بلاک میں وزارت اطلاعات و نشریات او قاف حج کے دفتر میں وزارت داخلہ میں کام کیا۔ ۱۹۷۵ میں وزارت داخلہ میں Statistical investigation کے لیے درخواست دی جو مسترد کر دی گئی۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ میں وزارت مذہبی امور میں سنٹرل حج آرگنائزیشن کے سپروائزر مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد ۱۰ ستمبر ۱۹۷۷ میں حج ڈائریکٹوریٹ کراچی میں گریڈ سولہ میں اسسٹنٹ پورٹ حج آفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۹ میں انہیں حکومت نے واپس اسلام آباد بھیج دیا پھر ۱۰ ستمبر ۱۹۸۰ میں جدہ روانہ ہوئے یہاں آپ کے زیر نگرانی ایک ریسیپشن تھی جس میں حجاج کرام اور سعودیہ میں ان کے عزیز و اقارب کے متعلق معلومات اور ہدایات دی جاتی تھیں۔ ۱۹۸۱ میں پبلک سروس کمیشن نے آپ کو وزارت امور میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے کے لیے موزوں قرار دیا۔ بہت جلد آپ نے استعفیٰ دے دیا ۴ جنوری ۱۹۸۴ میں حبیب بینک لمیٹڈ کمپیوٹر ڈویژن پریذیڈنٹ کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ بحثیت ڈپٹی جنرل مینجر حبیب بینک ان کی ریٹائرمنٹ ہوئی۔ خاور اعجاز کی شادی ۱۹۸۹ میں ہوئی۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ خاور اعجاز اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔

ادبی سفر:

خاور اعجاز کو بچپن سے ہی اردو ادب میں دلچسپی تھی۔ آپ آٹھویں جماعت میں تھے کہ ان کے اردو کے استاد یوسف نے انہیں تقریری مقابلوں کی جانب رغبت دلائی اسی بدولت مطالعے کا شوق ہوا۔ آپ ریڈیو پاکستان میں بچوں کے پروگرام میں شرکت کرتے رہے اور زمانہ طالب علمی سے ہی بچوں کی کہانیاں ناول

اور رسالے پڑھتے تھے۔ ادبی زندگی کا آغاز فروری ۱۹۶۸ کو گارڈن کالج کے زمانے سے ہوا جب غالب کی زمین میں پہلی غزل کہنے کی کوشش کی اولین مطبوعہ کاوش بچوں کی ایک نظم "وقت" ہے جو ۲۲ ستمبر ۱۹۶۸ کو خاور اعجاز کے نام سے روزنامہ جنگ میں شائع ہوئی۔ آپ کی دوسری شائع ہونے والی نظم "صبح" ہے۔ ادبی زندگی کے حوالے سے انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ "بچوں کی دنیا، میری ادبی زندگی کی پہلی پرورش گاہ تھی اور روزنامہ جنگ وہ پہلا کاغذی پیپر این ہے جو میرے الفاظ کے بدن پر سجا۔ "[۱۳] خاور اعجاز نے ۱۱ فروری ۱۹۶۸ سے لکھنے کا باقاعدہ آغاز کیا لیکن ان کی غزلوں کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۹ میں روزنامہ تعمیر راولپنڈی کی شعر و ادب کی تنقیدی محفل سے ہوا۔ ۱۹۷۱ میں آپ کی غزلیں روزنامہ جاوداں، ندائے حق، ہفت روز، وقار، ماہنامہ، ناموس خواتین، ہم سفر وغیرہ میں شائع ہونے لگی یہ سب راولپنڈی سے چھپتے تھے۔ آپ مختلف رسالوں کے مدیر اور مدیر اعلیٰ بھی رہے۔

خاور اعجاز کو اپنی ادبی زندگی میں بہت سی شخصیات سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جس سے وہ متاثر ہوئے سب سے پہلی ملاقات ان کی مضطر اکبر آبادی سے روزنامہ جنگ کے دفتر میں ہوئی، کرم حیدری سے ملاقات مضطر اکبر آبادی کے دفتر میں ہوئی، ضمیر جعفری سے ان کے گھر پر ہوئی، زمانہ طالب علمی میں احسان دانش سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، لاہور مجلس ترقی ادب کے دفتر میں احمد ندیم قاسمی سے ملاقات ہوئی، نیشنل سینٹر میں جوش ملیح آبادی سے ملے، ایک ٹی وی مشاعرہ کی شرکت میں فیض احمد فیض سے ملے۔ آپ وزیر آغا کی شخصیت سے بہت متاثر تھے ان سے ملنے کا شرف بھی آپ کو حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ جان ایلیا، شاید نقوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، قتیل شفائی، گلوکارہ گلشن آرا، دلاور فگار، شہزاد منظر، عظمت آرا اور شوکت صدیقی سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی۔

شخصیت:

خاور اعجاز فطرتاً کم گو، کم آمیز اور کھلے دل کے انسان ہیں۔ ان کا لہجہ شیریں، دھیما مزاج اور بااعتماد ساتھی ہیں۔ خاور اعجاز اپنے اندر علم کا وسیع خزانہ رکھتے ہیں، بے حد مہمان نواز ہیں، بے جا بات چیت سے پرہیز کرتے ہیں اور غصہ ان کو شاذ و نادر ہی آتا ہے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ "مجھے ہائی پروفائل ہونے کا قطعی شوق نہیں، کام سے کام رکھتا ہوں زیادہ مکس اپ نہیں ہوتا۔ "[۱۴] ہر انسان کی زندگی میں کچھ مقاصد ہوتے ہیں جن کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کے اصول و ضوابط مرتب کرتا ہے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے ساتھ اپنی آسودگی

کے لئے مزید مشاغل اپناتا ہے۔ خاور اعجاز مطالعہ کے بے حد شوقین ہیں۔ ان کو کتابوں سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے دفتر یا پھر کتابیں اس لیے باقی کاموں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کی پسندیدہ طویل نظموں میں آدمی نامہ (نظیر اکبر آبادی)، مدوجزر اسلام (حالی)، شکوہ جواب شکوہ (اقبال)، مسجد قرطبہ (اقبال) ،شاہنامہ اسلام (حفیظ جالندھری) اور آدھی صدی کے تناظر میں (وزیر آغا) شامل ہیں۔

ایوارڈز، اعزازات:

خاور اعجاز کی ادبی خدمات کو قومی سطح پر سراہا گیا اور ان کو کئی ایوارڈ اور اعزازات سے نوازا گیا۔

آپ کو میاں محمد بخش مجلس میاں محمد بخش بورے والا کی جانب سے ملا۔

خاور اعجاز کو یہ اعزاذ حاصل ہے کہ انہیں بطور نمائندہ ہائیکو شاعر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے نصاب میں شامل کیا گیا۔

انہیں فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی، راولپنڈی نے ان کی ادبی حیثیت کے اعتراف میں لوح اعزاز نوازا

انہیں ادب رنگ رائیٹرز فورم، ملتان نے ان کی ادبی حیثیت کے اعتراف میں لوح اعزاز نوازا۔

ادبی امتیازات:

صدر ادبی تحریک راولپنڈی

صدر لٹریری کلب ملتان، اسلام آباد

صدر پاکستان ہائیکو سوسائٹی (راولپنڈی، اسلام آباد) ۲۰۰۱ تا ۲۰۱۴

تصانیف:

خاور اعجاز شاعری کے متعدد کتب کے خالق ہیں انہوں نے بے تحاشا لکھا ان کے کتب کی تفصیل کچھ یوں ہے:

شیشے کا کنول	جولائی ۱۹۷۵ء
ارتقا	ستمبر ۱۹۸۲ء
آنکھیں، رنگ اور خواب	جنوری ۱۹۸۸ء

زرد پتیوں پر شبنم	جنوری ۱۹۹۳ء
دھیان	جنوری ۱۹۹۸ء
نئی پاکستانی اردو غزل	جنوری ۲۰۰۱ء
کسی معدوم رستے سے	جنوری ۲۰۰۲ء
آہٹ	جنوری ۲۰۰۵ء
انفرادی مطالعے	جنوری ۲۰۰۶ء
ساجن	جولائی ۲۰۰۶ء
اختصار	جنوری ۲۰۰۷ء
زیر لب	جنوری ۲۰۰۸ء
حوالہ	جنوری ۲۰۱۲ء
اذکار	جنوری ۲۰۱۳ء
نیرنگ غزل	مارچ ۲۰۱۵ء
لفظ مختصر سے مرے	مئی ۲۰۱۵ء
تمثیل	۲۴ ستمبر ۲۰۱۵ء

زیر ترتیب و اشاعت:

اردو غزل عہد بہ عہد (تذکرہ)

اردو غزل پاکستان میں (تاریخ و تنقید)

مجموعہ غزل (۲۰۱۲ تا حال)

2۔ شہزاد نیئر:

نوے کی دہائی کے مقبول ترین شاعروں میں شہزاد نیر کا شمار ہوتا ہے. انہوں نے شاعری کا آغاز آزاد نظم سے کیا. ترقی پسند شاعروں میں شمار کی وجہ سے ان کی نظموں میں سوچ کی گہرائی ملتی ہے ان کی شاعری کسی ایک معاشرتی نظریے کی اسیر نہیں وجود کی بہت سی سطحوں کے وقوف کی آئینہ دار ہے۔

نیلم ملک ان کی شاعری کے بارے میں کہتی ہیں کہ:

> "شاعری میں کئی نام ایسے ہیں جو اپنے ہنر اور لگن کی بدولت خود کو منوانے میں کامیاب رہے۔ ان چند ناموں میں نمایاں اور معتبر نام شہزاد نیئر کا ہے جن کا کلام پڑھنے کے بعد ادب کی بقا کے حوالے سے دم توڑتی امید میں نئی روح پھونکی جاتی محسوس ہوتی ہے اور یہ یقین پختہ ہونے لگتا ہے کہ جب تک شہزاد نیئر جیسے باکمال تخلیق کار سامنے آتے رہیں گے تب تک اردو ادب سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔"(۱۵)

شہزاد نیر کا تعلق گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں گوندلانوالہ سے ہے۔ ان کے آباواجداد ابتداء میں زراعت کے پیشے سے منسلک تھے ۔یہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب ۱۹۶۰ تا ۱۹۶۱ میں صنعتوں کا قیام عمل میں آیا تو ان کا خاندان اس شعبے سے منسلک ہو گیا۔ ان کے والد محترم کا نام محمد رفیق ہے اور والدہ محترمہ کا نام صغریٰ بی بی تھا جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ محمد رفیق نے صنعتوں کے آغاز کے وقت ایک فیکٹری میں معمولی ملازمت اختیار کی لیکن محنت اور کوشش سے آج ان کے والد گوجرانوالہ میں آئرن فیکٹری کے مالک ہیں۔ شہزاد نیئر کا اصل نام محمد شہزاد ہے۔ یہ ۲۹ مئی ۱۹۷۳ میں گوجرانوالہ کے گاؤں گوندلانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن گوندلانوالہ میں گزرا۔ یہ بہت قابل انسان ہیں۔ بچپن میں اپنی والدہ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ یہ سکول میں ہونے والے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ بچپن اور لڑکپن ان کا خالص دیہاتی ماحول میں محرومیوں کے ساتھ گزرا کیونکہ ان کے والدین معاشی طور پر خوشحال نہ تھے۔

شہزاد نیر نے ابتدائی تعلیم اپنے نواحی گاؤں گوندانوالہ سے حاصل کی۔ یہاں سے ۱۹۸۹ میں میٹرک کا امتحان اور ۱۹۹۱ میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ فوج میں سلیکشن کے باعث انہوں نے بی ایس سی ترک کر کے ۱۹۹۳ میں پاک فوج میں شامل ہو گئے۔ یوں گریجویشن ۱۹۹۵ میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ کے دوران مکمل کی۔ ۲۰۰۵ میں ایم اے اردو بلوچستان یونیورسٹی سے کیا۔ ۲۰۲۰ میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس

سی ماس کمیونیکیشن کیا۔ ۲۰۱۴ میں فارسی زبان میں ڈپلومہ کیا اور ۲۰۱۸ میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن میں ایم فل کیا۔ شہزاد نیر نے دفاعی ادارے کی ملازمت اختیار کی ریٹائرمنٹ کے بعد اب مختلف اداروں میں لیکچرار کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ شہزاد نیر نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ان کے ماموں زاد ریحانہ کوثر سے ۱۹۹۶ میں ہوئی۔ وہ ایک سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں وہ ایک ادیب شاعر فلاسفر کو اس طرح نہ سمجھ سکتی تھیں جیسے ایک پڑھی لکھی عورت سمجھ سکتی ہے۔ شہزاد نیر نے اپنی ہم مزاج سیما فردوس سے ۲۰۰۴ میں اپنی پسند سے شادی کرلی۔ سیما فردوس ایک باشعور اور سلیقہ مند خاتون ہیں۔ ۲۰۱۴ میں سرطان کے باعث ریحانہ کوثر راولپنڈی میں اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ شہزاد نیر کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ یہ اپنی رفیقہ حیات سیما فردوس کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔

شہزاد نیر صاف گو، خوش مزاج، نرم طبیعت، باوقار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے مزاج میں ٹھہراو ہے۔ غلط بیانی کبھی نہیں کرتے ہمیشہ حق اور سچ کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ معاملہ فہم ہیں۔ ان کا لہجہ شیریں اور گفتگو نہایت شائستگی سے کرتے ہیں ان کو غصہ بہت جلد نہیں آتا ہر کام اور معاملے میں تحمل سے کام لیتے ہیں۔ شہزاد نیئر کی شخصیت پر اپنی والدہ محترمہ کے اثرات بہت زیادہ ہیں ان کا زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ شہزاد نیر کا کہنا ہے کہ

> "مغرور اور بناوٹی لوگوں سے نہیں بنتی کھلے ذہن کے ساتھ سیکھنے پر کمربستہ لوگ اچھے لگتے ہیں۔ شاعروں، ادیبوں اور آرٹ سے پیار کرنے والے لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گزرتا ہے جو کوئی سماج اور رواج کی زنجیریں توڑ کر اپنے اندر کا خالص انسان آزاد کرالیتا ہے اس کی قدر اور احترام کرتا ہوں۔"(۱۶)

ادبی سفر:

شہزاد نیئر کو بچپن سے ہی اردو ادب میں دلچسپی تھی۔ شہزاد نیئر نے ساتویں جماعت سے شاعری کا آغاز کیا سب سے پہلے انہوں نے ایک پابند نظم لکھی۔ ان کو شاعری سے خاصا لگاؤ تھا۔ ان کی پہلی غزل اخبار "نوائے وقت" میں شائع ہوئی۔ ی شاعری میں ماجد الباقری سے اصلاح لی پھر جان کاشمیری نے ان کی شاعری کی اصلاح کرکے ان کے حسن کو مزید نکھارا۔ میٹرک تک انہوں نے کافی نظمیں اور غزلیں لکھ لی تھیں اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ فوج میں شمولیت سے پہلے ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں مختلف رسائل

میں چھپتی رہیں۔ فوج میں سلیکشن کے بعد بھی انہوں نے شعر و شاعری کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بہت سی نظمیں شہزاد نیئر کی ملٹری اکیڈمی کے رسالہ "قیادت" میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے کراچی، راولپنڈی، گوجرانوالہ، اسلام آباد، فیصل آباد، ملتان، کشمیر سرگودھا اور گجرات میں مشاعروں میں شرکت کر کے خوب داد وصول کی۔ ۲۰۰۱ میں نظم "سیاچن" لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ ان کی دو طویل نظمیں "خاک" اور "نوحہ گر" کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ شہزاد نیر کی شعر و شاعری کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ شہزاد نیئر حلقہ ارباب ذوق کے رکن ہیں ۔ان کو لسانیات پر عبور حاصل ہے۔ یہ ادب شناس شخصیت ہیں۔ ان کو ادبی حلقوں میں جانا بہت پسند ہے۔ یہ غالبؔ، فیضؔ، میر اجی اور ن م راشد کی شاعری کو سراہتے ہیں۔ اردو شعر و شاعری کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے بہت سے مشاعرے کروائے ہیں تا کہ اردو ادب کو فروغ مل سکے۔ مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے شعراء ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے کلام سے مستفید ہوتے ہیں۔ ادبی خدمات میں ایک بڑا کارنامہ ان کا یہ ہے کہ انہوں نے گوندا والہ میں ایک پبلک لائبریری قائم کی اور آج بھی لوگ اس لائبریری سے مستفید ہوتے ہیں۔ شہزاد نیئر کی ادبی تخلیقات مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رسائل میں گونج، نوائے وقت، فنون، اوراق، ابلاغ اور قیادت شامل ہیں۔

شہزاد نیر کا اہم اور بنیادی مشغلہ شاعری اور مطالعہ ہے۔ مطالعے کے بے حد شوقین ہیں۔ ان کو اردو، فارسی، انگریزی، ادب، غیر ادب، تاریخ، فلسفہ، مذہبی متون، احادیث، بائبل اور بدھ مت ان سب کے مطالعہ کا شغف ہے۔ انہیں سماجی اور تاریخی موضوعات پر مبنی فلم دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ان کو موسیقی سے بھی رغبت ہے۔ وہ گانے کو نہ صرف سنتے ہیں بلکہ اس کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔

موسیقی کے متعلق شہزاد نیر کہتے ہیں کہ

> "میں کوئی اور کام کرتے ہوئے موسیقی نہیں سنتا۔ کام چھوڑ کر آنکھیں بند کر کے خود کو سروں کے سمندر کی لہروں کے حوالے کر دیتا ہوں یقین کریں یہ بہت بڑا تجربہ ہوتا ہے۔"(۱۷)

ایوارڈز، اعزازات:

شہزاد نیئر ملکی اور غیر ملکی ادبی تنظیموں کی جانب سے بے شمار ایوارڈز اور اعزازی شیلڈ حاصل کر چکے ہیں۔

برفاب PENانٹرنیشنل ایوارڈز ۲۰۰۷ء

چاک سے اترے وجود پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ ۲۰۱۰ء

صوفی غلام مصطفی تبسم، ایوارڈ بدست منیر نیازی ۲۰۰۳ء

سفینہ ادب ایوارڈ ۲۰۰۸ء

گرہ کھلنے تک کاروان حرف و قلم بدست جلیل عالی ۲۰۱۴ء

فیض امن ایوارڈ ۲۰۱۰ء (انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان)

بزم اقبال ایوارڈ ۲۰۱۱ء

ریشم ڈائی ایوارڈ ۲۰۱۴ء

سخن ایوارڈ (صدائے سخن ادبی تنظیم) ۲۰۱۹ء

تصانیف:

شہزاد نیئر کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جو درج ذیل ہیں:

برفاب ۲۰۰۶ء

چاک سے اترے وجود ۲۰۰۹ء

گرہ کھولنے تک ۲۰۱۳ء

خوابشار ۲۰۱۹ء

حال ہی میں انہوں نے ایڈورڈ ڈی بونو کتاب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی۔

3۔ اختر عثمان:

اردو شاعری میں اسی کی دہائی میں منظر عام پر آئے۔ ان کا شمار اردو شاعری کی توانا آوازوں میں ہوتا ہے۔ ہمہ جہت اور قادرالکلام کے الفاظ جن شاعروں کو زیباہیں ان میں اختر عثمان شامل ہیں۔ اختر عثمان مشہور شعراء میں شمار نہیں ہوتے لیکن ان کی شاعری بہت جلد مشہور ہوئی۔ یہ ایک شاعر، محقق، مرثیہ نگار، تنقید

نگاراور مترجم ہیں۔ ان کا لسانی سرمایہ حیرت انگیز اور قابل رشک ہے۔ اردو دنیا کی کلاسیکی روایت میں جیسا درک یہ رکھتے ہیں ہمارے عہد میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اختر عثمان کا تعلق پنجاب کے شہر اسلام آباد سے ہے۔ ان کے آباواجداد زراعت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ یہ شروع سے اسلام آباد میں مقیم تھے۔ اختر عثمان کے والد محترم کا نام غلام محمد اور والدہ محترمہ کا نام انصار جہان ہے۔ ان کے والدین نہایت سادہ مزاج کے مالک ہیں۔ ان کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔

اختر عثمان کی پیدائش ۱۴اپریل۱۹۶۹ کو اسلام آباد میں ہوئی۔ بچپن کے تین چار سال اسلام آباد میں ہی گزرے بعد کا تمام عرصہ راولپنڈی میں گزرا۔ بچپن سے ہی محنتی اور قابل طالب علم تھے۔ آپ شریر بچے نہ تھے بلکہ بہت شریف اور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ نصابی کتب کے علاوہ غیر نصابی کتب بھی شوق سے پڑھتے تھے۔ اختر عثمان نے ابتدائی تعلیم سینٹ پال کیمرج سکول سے حاصل کی پھر یہاں سے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۸۵ میں سیٹلائیٹ ٹاون کالج میں گیارہویں جماعت میں داخلہ لیا۔ ۱۹۸۶ میں اس کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیااور ۱۹۸۸ میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ۱۹۹۱ میں نمل یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کا کورس کیا۔ ایف اے کے فورابعد ۱۹۸۶ میں اختر عثمان نے سب سے پہلے شناختی کارڈ کے دفتر میں کلریکل جاب شروع کی۔ اس کے بعد حلقہ ارباب ذوق میں جوائنٹ سیکرٹری کے طور پر ساڑھے چھ برس ملازمت کی۔ انہوں نے کئی امتحانات پاس کیے اور گزٹ افیسر تک پہنچے۔ ۱۹۹۶ میں صحت کی خرابی کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے بعد اخبارات اور صحافت میں کام شروع کیا۔ صحافت میں ایڈیٹر انچارج کچھ عرصہ کام کیا۔ ضیاالدین ڈان اخبار کے ایڈیٹر تھے ان کے کہنے پر انہوں نے کالم لکھے۔ اختر عثمان آج کل ایک اکیڈمی میں ٹرانسلیشن کا کام کرتے ہیں۔

اختر عثمان کی شادی ۱۳مئی ۱۹۹۳ کو ماموں زاد عابدہ بی بی سے ہوئی۔۔ ان کے تین بچے ہیں جن میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بچوں میں کسی کا بھی شاعری کی طرف رجحان نہیں ہے۔ اختر عثمان کے اپنے رفیقہ حیات کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں وہ خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ انسان کی شخصیت اس کی اصل پہچان ہوتی ہے۔ کسی بھی انسان کو اچھایا برا بنانے میں شخصیت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ دانشور، ہنر پرور، شاعر، ادیب، مترجم، نقاد اور علم دوست انسان ہیں۔ اختر عثمان خوش گو اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ دھیمے لہجے اور اعلی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

ادبی سفر:

اختر عثمان کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۵ میں ہوا۔ زمانہ طالب علمی میں بھی نظمیں اور غزلیں لکھتے تھے جو بین الاقوامی رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ اسکول کے رسالے پولین کے ایڈیٹر تھے۔ اس رسالے کے لئے انگریزی اور اردو زبان میں نظمیں اور آرٹیکلز لکھتے تھے۔ڈاکٹر احسان اکبر کے علاوہ جن دو شخصیات نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا اور ان کا خاص مزاج بنایا ان میں مظفر علی سید مرحوم اور ضیا جالندھری شامل ہیں۔انہوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ڈاکٹر احسان اکبر اردو جبکہ مظفر علی سید مرحوم اور ضیا جالندھری غیر تدریسی شاعری کے استاد ہیں۔ اختر عثمان کالج میگزین کے بھی ایڈیٹر رہے کالج کے اردو اخبار کا نام ''تنقید'' اور انگریزی اخبار کا نام ''ایروپچیٹیکا'' تھا۔ ۱۹۸۵ میں باقاعدہ ادبی رسالہ جنگ میں ان کی تحریر چھپی۔ فنون، ادبیات اور دیگر رسالوں میں اختر عثمان کی نظمیں غزلیں اور تنقیدی مضامین چھپتے رہے۔ ان کو ہندی، فارسی، انگریزی، اردو، پنجابی اور پوٹھوہاری زبان پر عبور حاصل ہے۔ اختر عثمان انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ

> ''بنیادی طور پر کلاسیکل شعر وادب کا دلدادہ ہوں اور جدت پسندی سے کم ہی سروکار ہے۔ آج بھی میرؔ، غالبؔ، بیدلؔ، حافظؔ، خیامؔ اور انیسؔ کو شوق سے پڑھتا ہوں اور اپنے معتبر شعراء سے ذہنی وابستگی رکھتا ہوں۔''(۱۸)

اختر عثمان کو مطالعہ کا بے حد شوق ہے .ان کا زیادہ وقت کتابوں کا مطالعہ کرنے میں گزرتا ہے۔ ''۲۷ برس تک میں صبح چار بجے سے رات ۱۰ بجے تک پڑھتا تھا۔ ۲۰۰۳ میں برین ہیمرج کی وجہ سے ڈاکٹر کے کہنے پر اب صرف چار گھنٹے روزانہ مطالعہ کرتا ہوں۔''(۱۹) روزانہ شام پانچ بجے واک کرتے ہیں اور ساڑھے چھ بجے شام تمام دوست احباب کی محفل میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے ہیں ۳۳ برس ہوگے ہیں یہ سلسلہ جاری ہے۔

اعزازات ایوارڈز:

اختر عثمان ادبی تنظیموں کی جانب سے درج ذیل ایوارڈز اور اعزازات حاصل کر چکے ہیں:

احمد فراز ایوارڈ

خالد احمد ایوارڈ

صدائے سخن ادبی تنظیم کی طرف سے سخن ایوارڈ ۲۰۱۹ء

بزم انیس کی جانب سے ۱۹۹۲ء میں یاد گار انیس ایوارڈ ملا

بہترین سکرپٹ پی ٹی وی ایوارڈ

حلقہ ارباب ذوق نے اختر عثمان کو حلقے کی خدمات پر ۲۰۰۶ء میں نشان اعزاز دیا۔

تصانیف:

اختر عثمان نے بہت سی کتب لکھیں۔

مطبوعہ:

قلمرو	۱۹۹۳ء
ہمکلام	۱۹۹۵ء
کچھ بجالائے ہیں	۲۰۰۲ء
ابد تاب	۲۰۱۰ء
ستارہ ساز	۲۰۱۱ء
چراغ زار	۲۰۱۷ء
تراش	۲۰۱۸ء

زیر طبع کتابیں:

تراش خراش

صد پارہ

چنیدہ

اشک آباد

بجھن رس

دیوان میر فارسی

زبان شیشہ

عالمی ادب

رویل سویل

ہ: نظموں کا تعارف

1۔ نوحہ گر:

"نوحہ گر" شہزاد نیئر کی دوسری طویل آزاد نظم ہے۔ یہ نظم پانچ سال کے طویل مدت میں تخلیق ہوئی۔ سب سے پہلے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں اسے پڑھا گیا جس کی صدارت ایوب خاور نے کی بعد ازاں سانجھ پبلی کیشنز لاہور نے اسے کتابچہ کی شکل میں چھاپا گیا۔ اس کا ٹائٹل سید ابراہیم نے بنایا جس کے بعد یہ نظم ۲۰۱۳ میں شائع ہونے والے مجموعہ نظم گرہ کھلنے تک میں شامل ہوئی۔ "گرہ کھلنے تک "شہزاد نیئر کی تیسری ادبی کاوش ہے جو کہ ۴۷ آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ نظم نوحہ گر ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ نظم کے آغاز میں ایک شعر درج ہے ملاحظہ ہو

صعف تسلیم مگر جم اسیر ان جفا!

کوئی چارہ تو کرو شور دہائی ہی سہی

نظم کے پہلے مصرعے کے پہلے لفظ سے لے کر نظم کے آخری لفظ تک فعولن کی بحر استعمال ہوئی ہے۔ طویل نظم نوحہ گر ایک داستان ہے جو کہ ناموجود سے موجود کے تمام مظاہر کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔ شہزاد نیئر نے خود کو ایک ایسے کردار کی شکل میں پیش کیا ہے جو کہ ناموجود سے موجود تک کی تمام وارداتوں کو نہ صرف مشاہداتی نگاہ سے دیکھ رہا ہے بلکہ اس پر نوحہ کناں بھی ہے۔ شہزاد نیئر نے تواریخ کا مشاہداتی مظاہرہ ایسے کیا جیسے وہ کن سے اب تک کے مراحل کے عینی شاہد ہوں۔ نظم کے موضوع کے بارے میں کہتے ہیں کہ "نوحہ گر نظم کا موضوع تاریخ انسانی ہے۔ اس میں انسان کی تخلیق سے آج تک کی تہذیب کی عکاسی کی گئی

ہے۔"[۲۰] یہ مکالماتی و استعاراتی نظم ہے۔نوحہ گر نظم کا واحد مرکزی کردار ہے جو پوری تاریخ کا نوحہ اور تاریخ میں قتل انسانیت بیان کرتا ہے۔شہزاد نیئر نے وقت کی زبانی اس کائنات کے وجود میں آنے اور زمین پر زندگی کی آغاز کے حوالے سے کچھ واقعات بیان کیے ہیں یعنی دنیا کی تاریخ و تہذیب کا ارتقائی جائزہ نوحہ گر کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔انہوں نے مختلف زمانوں میں انسان پر ہونے والے ظلم و ستم کو بہت دردناک انداز سے بیان کیا ہے۔کردار نوحہ گر کے بارے میں شہزاد نیئر بتاتے ہیں کہ:

> "نظم کا کردار نوحہ گر یعنی رونے دھونے والا۔یہ انسانی غارت گری کو دیکھ کر روتا ہے اس کی آنکھیں نم ہیں۔پیدائش وقت سے لے کر فنا کی آخری ہچکی تک کی اجتماعی تخریب میں ہونے والے نقصانات کو گننے اور ان پر نوحہ خوانی کے عمل میں لگا ہوا ہے۔"[۲۱]

نظم لاوجودیت سے موجودیت اور قنوطیت سے رجائیت کی طرف سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔اس میں نوحہ گر بیک وقت قدیمی بھی ہے اور نوحہ گر بھی۔یہ کردار ایک طرف تجزیے میں مصروف اور دوسری طرف ماتم کرتا نظر آتا ہے، کبھی اس کی حیثیت متشکک تو کبھی شاعر کی نظر آتی ہے۔شاعر اس نظم میں انسان کے انسان ہونے سے لے کر اشرف المخلوقات بننے اور پھر اشرف المخلوقات سے حیوانیت کے زمرے میں آنے کا تمام سفر نامہ بیان کرتا ہے۔شہزاد نیئر نے تاریخ میں عورتوں پر ڈھائے گئے مظالم کا ذکر اور انسان کے کن نظریات کو بنیاد بنا کر قتل و غارت کی یہ سب نوحہ گر میں مشاہداتی طریقہ سے بیان کیا ۔دراصل یہ نظم ہستی سے بستی ہونے کی اور پھر اس ہستی کے دنیا کی بستی کو بسانے کی ،خوف کی زمین سے دیوتاؤں کی فصل اگانے اور دیوتاؤں کو ایک خدا میں سمانے کی پھر اب آباد بستیوں کو مذہب کے نام پر برباد کرنے کی کہانی ہے۔نوحہ گر اپنے مضمون کے اظہار، طوالت اور پرفیکشن کے لحاظ سے ایک مکمل نظم ہے مگر اس نوحہ کے آخری الفاظ میں قدیمی ہوں مجھ سے سنو ذات کی غلام گردشوں میں مسلسل بازگشت کرتے اور تجسس کر کے دروازوں پر بے پناہ دستک کرتے ہیں کہ اس قدیمی شاید سے اپنا مشترکہ مغموم نوحہ مزید سنا جائے۔بقول سعید ابراہیم:

> "شہزاد نیر کی طویل نظم نوحہ گر ان کے اندر رچے بسے تاریخی اور عصری شعور کا باکمال شاعرانہ اظہار ہے جس میں انہوں نے کمال مہارت سے بے قید وقت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔"[۲۲]

یہ حقیقت افروز نظم ازل سے حال تک کا سفر ہے۔نوحہ گر ہماری باطنی بصارتوں کو روشن کرنے، معاشرتی بگاڑ کی اصلاح، ذاتی مسائل سے لے کر اجتماعی زیادتیوں کی نشاندہی اور درست سمت میں شعور بیدار کرنے کی عظیم کاوش ہے۔ انہوں نے جہاں کن کی داستان کو ایک نیالب ولہجہ دیاوہاں ان کے فن پر دسترس کااظہار بھی کھل کر سامنے آیاہے۔ سائنسی عوامل کونہ صرف اپنی زبان میں نہایت عمدگی سے ترجمہ کیاگیابلکہ لسانیات کو ایک نیااور شائستہ رخ دیتے ہوئے مرصع کاری سے شعری قالب کے مطابق زبان وبیان کو واضع کیاگیاہے جو کہ واقعی منفرد کام ہے۔

2۔ تمثیل:

"تمثیل "خاور اعجاز کی آزاد طویل نظم ہے . یہ نظم تین برس میں مکمل ہوئی اور سب سے پہلی بار ۲۰۱۳ میں پڑھی گئی بعد ازاں کتابی صورت میں شاخسار پبلی کیشنز سے ۲۴ ستمبر ۲۰۱۵ میں شائع ہوئی۔اس کا دیباچہ ڈاکٹر سیتہ پال آنند نے لکھاہے۔ یہ نظم ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی بحر ہزج مربع سالم ہے۔یہ نظم اسلامی تہذیبی نظریے کے تحت لکھی گئی۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔خاور اعجاز نظم کے عنوان کے بارے میں بتاتے ہیں کہ "نظم کا انداز بیان چونکہ ڈرامائی ہے اور ڈرامہ کئی طرح کے حصوں پر مشتمل ہوتاہے اس لیے اس کا عنوان تمثیل رکھا گیاہے۔"(۲۳)

تاریخ انسانی اس نظم کا موضوع ہے۔اس میں آغاز آفرینش سے اب تک کی تاریخ اور انسان کو مختلف ادوار میں بیان کیاگیاہے۔ نظم کے دو بنیادی کردار ہیں ایک زمانہ اور دوسرا واحد متکلم یعنی انسان ہے ۔ نظم کردار واحد متکلم جو پوری انسانیت کا سمبل ہے کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں زمانے اور انسان کے متعلق سوالات کو سفر نامے کی صورت میں قلم بند کیاگیاہے۔ذہنی سطح پر یہ سفر نامہ ایک ایسی دستاویز ہے جس میں ہر مسافر لمحہ تھکن سے چور، شکستہ حال اور آبلہ پاہے لیکن یہ امید کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتاہے کہ کبھی تو خالق سے دوائی کا ذوالقرنین رشتہ ایک ایسی صورت میں تبدیل ہو گا جسے واحدہ یا آکائی کہا جاتاہے۔ نظم قاری کو سوچنے اور سوالات کرنے پر مجبور کرتی ہے مثلاً زمانہ کیاہے؟ زمانہ سے مراد کون ہے؟ تصور وقت کیاہے؟ اور واحد متکلم کس مذہب سے تعلق رکھتاہے؟ خاور اعجاز نظم کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

> "نظم تخلیق کائنات کے اولین عمل ہبوط آدم اور انسان کے زمین پر اتارے جانے کے واقعات سے لے کر انسان کے دنیا سے رخصت کے مدارج کا احاطہ کرتی ہے۔"(۲۴)

تمثیل سات زمانوں پر مشتمل ہے۔اس کا پہلا زمانہ کائنات کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بگ بینگ دھماکے سے ہونے والی تخلیق کا عمل جاری وساری ہے۔ دوسرے اور تیسرے زمانے میں آدم کی تخلیق اور اس کے بعد کے منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ چوتھے زمانے میں ایک پریشان حال آدمی کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے سوالات کے جوابات تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ یہ زمانہ اس ذہنی تگ دو کا اشاریہ بھی ہے اور اعلانیہ بھی جو آنے والے زمانوں میں متشکل ہونے والی ہے۔ پانچویں زمانے میں رجائیت کا عنصر نمایاں ہے ۔کردار واحد متکلم نہ صرف ماضی سے آگاہ، حال سے آسودہ بلکہ مستقبل کے لیے بہتر خواہش رکھتا ہے اور یہی انسان امید کے سہارے جانے کہاں سے کہاں سفر کرتا چلا جارہا ہے۔

نظم میں چھٹا اور ساتواں زمانہ اسی داستان کو آگے لے کر چلتا ہے۔ ایک طرف انسان کی حسرتیں، خواہشات، چاہتیں اور ارمان ہیں تو دوسری طرف احتیاج اور اقتضا کا ذکر ہے۔ دونوں جہتیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ درحقیقت یہ زمانے انسان کی امید وبہم کے درمیان ڈولتے رہنے کی کہانی سناتے ہیں کہ خدا نے انسان کے لیے دنیا کو روشنی سے منور کیا۔ اسی روشنی نے انسان کو صحیح منزل بتائی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کذب کی قوتیں غلبہ پاتی گئیں۔ اسی کی بدولت انسان خود غرض، لالچ کا شکار اور قتل وغارت کرنے لگا۔ بقول ڈاکٹر سیتہ پال آنند:

> "یہ کن سے شروع ہو کر ابتدائے آفرینش کو اپنی بنیاد بناتی ہوئی وقت اور فاصلہ طے کرتی ہوئی نہ صرف سے چھ زمانوں کے ان گنت نوری سالوں کے عرصے طے کرتی ہے بلکہ ساتویں زمانے کی خبر رسائی کرتی ہے اور اس لحاظ سے اردو میں اس قسم کی واحد نظم ہے۔"(۲۵)

تمثیل اپنی سرشت میں منفرد اور بے بدل ہے۔ اس نظم کو شاعر نے مضمون کی طوالت کے باوجود نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ نظم میں بہت معنویت ہے انسان جہاں ایک طرف امید کے سہارے آگے بڑھتا ہے وہاں بے اطمینانی، شکوہ شکایت، دل برداشتگی کے جذبات بھی رکھتا ہے، شاعر بڑی مہارت سے صف بہ صف استمراری بیانیہ رواں دواں چلتا ہے۔ نظم کے آخر تک اپنا پیغام بخوبی (قاری تک) نشر کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ خاور اعجاز کی بہترین کارشوں میں سے ایک کاوش تمثیل ہے۔

3۔ تراش:

"تراش" اختر عثمان کی طویل نظم کا عنوان ہے جو ایک سال کے عرصے میں تخلیق ہوئی۔ اس کے چالیس ڈرافٹ لکھے گئے۔ یہ نظم کا اکتالیسواں ڈرافٹ ہے۔ یہ نظم پہلی بار اسلام آباد میں نیا پاک ٹی ہاؤس ماشاءاللہ میں پڑھی گئی بعد ازاں یہ کتابی صورت میں رومیل ہاوس آف پبلی کیشنز نے اپریل ۲۰۱۸ میں شائع کی۔ یہ ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ انتساب استاد گرامی ڈاکٹر احسان اکبر اور منظر نقوی کے نام ہے۔ کتاب کا دیباچہ مشہور ترقی پسند ادیب جناب یوسف حسن مرحوم نے لکھا ہے۔

نظم کے آغاز میں درج ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

تاخموش دا تستیم آفاقہ بی تشویش بود

موج این بحر از زبان ما تلاطم کردہ است

نظم فعول فعلن کے سیٹ کی تغریب و تقلید کے ساتھ لکھی گئی۔ نظم کا ایک ایک مصرع بڑی سنجیدگی اور تفکر کے ساتھ تحریر کردہ ہے۔ نظم میں ابتدائیہ اور اختتامیہ کے علاوہ چودہ کینٹوز ہیں۔ نظم آزاد اور پابند ہیت میں لکھی گئی۔ نظم کا موضوع روئے زمین پر آدم کی مجموعی سرگزشت ہے یعنی فطری ماحول میں نوع انسانی کی اپنی بقا اور نشوونما کے لیے سماجی جدوجہد ہے۔ اس نظم میں شاعر سے انسانی بقا اور اس کی نشوونما کے انسانیت نواز امکانات کو حقیقت پذیر کرنے کی فکری و عملی مساعی کی ترجمانی مختلف پہلوؤں سے کی ہے۔ یہ نظم انسانی تاریخ کے ماضی کی ساعت صفر سے شروع ہوتی ہے اور انسان سماج کے پیچ در پیچ اور پر فراز و نشیب سفر کی منظوم قصہ گوئی کرتے ہوئے مستقبل کی ساعت سبز میں جا اترتی ہے۔ تخلیق اور تاریخ اختر عثمان کا بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ انسان کی زمین پر آمد سے لے کر اب تک جو بھی ہوا، بنی نوع انسان کی تاریخ، انسان نے کیسے بربریت اختیار کی، کیسے انسانیت کی خدمت کی، خصوصا جو طبقاتی جدوجہد ہے یہ سب کچھ ترقی پسند نظم تراش میں بیان ہوا ہے۔

بقول اختر عثمان

> "نظم کے پیچھے خیال، محرک یہ تھا کہ میں Human History دیکھنا چاہتا تھا اس لیے خاص کردار سنجوگتا بنایا۔ یہ اسلام کا ایک کردار ہے، پرانے قبیلوں میں اس کردار کے ذریعے لڑائی ہوئی۔ سنجوگتا کا مطلب دوستانہ ہے سنجوک سے سنجوگتا ہے۔"(۲۶)

نظم کا کردار سنجو گتا ہے۔ تراش کے اولیں کینٹو کی ابتدا میں اختر عثمان کا اعلان سنجو گتا کے لیے قاری کو ذہنی طور پر اساطیری فضا کے لیے تیار کر دیتا ہے۔ نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے قاری خود کو تاریخ کی راہ داریوں میں محسوس کرتا ہے۔ ظلم، ناانصافی، تاریکی کے ساتھ روشنی اور خیر کے پہلوؤں کا بھی نظارہ کرتا ہے۔ نظم کے پابند اور آزاد حصے انسانی غلامی اور آزادی کا حصہ اس قدر خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری تاریخ انسانی کی وحشت اور غارت گری بھول کر شاعر کی سخن طرازی کی داد دینے لگتا ہے۔ شاعر نے اس میں معاشرتی عدم مساوات کا بیان، انسان کی ازلی صورتیں، انسان پر ہونے والے ظلم و ستم اور انسانی وجود سے رونما ہونے والی بربادی کا ذکر عمدگی سے کیا ہے۔ تراش انسانوں کی آبادی سے زمین کی آبادی کا نوحہ ہے جو سینہ سنگ سے بھی پھوٹتا ہے اور منقاد طیور سے بھی۔ اس تمام کرب میں انسان کے وجود کی مرکزیت ختم نہیں ہوتی کیونکہ اس کائناتی جدلیاتی عمل میں انسان کا اپنا حصہ ہے اور انسانی وجود سے رونما ہونے والی بربادی اور آبادی کے بغیر داستان ادھوری اور ناتمام ہے۔

بقول خورشید رضوی:

> "تراش ایک تہہ دار فن پارہ ہے ایک قرات اس کے اسرار کھولنے کے لیے کفالت نہیں کرتی میں اسے اردو نظم کے سرمائے میں ایک جاندار اضافہ کرتا ہوں۔"(۲۷)

تراش اپنے عہد کی بڑی نظم ہے اس کی خوبصورتی ہے کہ نظم کے مصرعوں میں ابلاغ موجود ہے لیکن جب مصرعے مل کر ایک بڑا کل بناتے ہیں تو اس میں وہی ابہام پیدا ہو جاتا جو بذات خود زندگیوں اور کائنات میں موجود ہے۔

حوالہ جات

1. قاضی عبدالقدوس عرشی، "اصناف ادب اور علم بیان وبدیع"، مکتبہ عالیہ، لاہور، س ن، ص ۷
2. مجنوں گورکھپوری، "جدید نظم کی ہیت و تشکیل" (ایک مذاکرہ) از نگار، جدید شاعری نمبر، ص ۱۴۴
3. جمیل جالبی، ڈاکٹر، "ارسطو سے ایلیٹ تک"، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲۰
4. رفیع الدین ہاشمی، "اصناف ادب"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۹۸
5. "نگار" پاکستان، جدید شاعری نمبر (مضمون)، جدید شاعری کا ترقی پسند دور 1936 سے قیام پاکستان تک، ص ۲۸
6. رفیع الدین ہاشمی، ایضاً، ص ۱۰۱
7. ایڈگر ایلن پو، باحوالہ مغرب کے تنقیدی اصول از سجاد باقر رضوی، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۳
8. نسیم عبدالمجید ، طویل نظم کے رجحانات ، غیر مطبوعہ مقالہ ، ایم اے اردو، مخزونہ پنجاب یونیورسٹی ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳
9. انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۵۱۸
10. رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۷
11. رشید امجد ، ڈاکٹر، پاکستان کی نئی نظم پر گفتگو ، مشمولہ پاکستانی ادب ، جلد اول ، ایس ٹی پرنٹرز ، راولپنڈی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۴۷
12. شمس الرحمان فاروقی، طویل نظم، مختصر نظم، مضمون مشمولہ اوراق، لاہور، جلد ۱۹، شمارہ 3، 4 مارچ، اپریل ۱۹۸۴ء، ص ۱۰
13. خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۸ مارچ ۲۰۱۹ء، راولپنڈی
14. ایضاً
15. نیلم ملک، مضمون محبتیں شفقتیں مشمولہ خوابشار از شہزاد نیئر بک کارنر، جہلم ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۰، ۱۵۹
16. مدثر راجہ، "روزنامہ ایکسپریس"، اسلام آباد، ۱۴ جنوری ۲۰۱۶ء، ص ۱۶
17. ایضاً
18. اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۵ اپریل ۲۰۱۹ء، 4:00PM
19. ایضاً
20. شہزاد نیئر، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری ۲۰۱۹ء، راولپنڈی

21. ایضاً
22. سعید ابراہیم (مشمولہ) گرہ کھلنے تک، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۱
23. خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۸ مارچ ۲۰۱۹ء، راولپنڈی
24. ایضاً
25. سیتہ پال آنند، ڈاکٹر، دیباچہ، تمثیل، شاخسار پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۴ ستمبر ۲۰۱۵
26. اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۵ اپریل ۲۰۱۹ء، 4:00PM
27. خورشید رضوی کے تاثرات

باب دوم:

تین معاصر نظموں کے ذیلی موضوعات کا تجزیہ

اردو شاعری کا ابتدائی سرمایہ اصناف نظم میں ہی ملتا ہے۔ قدیم ادب کا جب مطالعہ کریں تو وہ نثر کی بجائے شعری صورت میں ہے۔ اس دور میں جو طویل رزمیہ نظمیں لکھی گئیں ان کو کلاسیکی کا درجہ حاصل ہے۔ جدید اردو شاعری میں آزاد نظم کے امام میر اجی ہیں جن کی روایت کو بعد ازاں مجید امجد اور ن م راشد نے زندہ تعبیر کیا۔ روایتی شاعری سے ہٹ کر نثری نظم اور شعرا نے اپنے سخن میں ڈھالا ہے۔ ان میں خاور اعجاز ، اختر عثمان اور شہزاد نیر بھی شامل ہیں ان کی تخلیقات ہمارے عہد کی ایک بہت پر ماجر تخلیقات ہیں۔ طویل نظمیں وہ نہیں جس سینکڑوں یا ہزاروں صفحات پر مشتمل ہوں بلکہ پانچ یا دس صفات میں بھی ایک طویل اور گہرے خیال کو ایک بڑا شاعر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اختر عثمان، خاور اعجاز اور شہزاد نیئر کی طویل نظمیں احساس ، توانا اور بکھرے ہوئے لہجے کی بھرپور عکاس ہیں۔ نظموں کے موضوعات کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ موضوع کے بارے میں جان لیا جائے۔

موضوع:

موضوع عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی وضع کیا گیا۔ اصطلاح میں وہ شے جس کا بیان اس علم میں ہو ۔" مدعا۔ مضمون " موضوع کو انگریزی میں topic کہا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں subject اور theme کے لیے علیحدہ علیحدہ معانی وضع کیے گئے ہیں مگر اردو میں ایک ہی معنی تصور کیا جاتا ہے۔ ادب پارہ بنیادی طور پر دو چیزوں سے مل کر بنتا ہے ایک اسلوب اور دوسرا موضوع۔ کسی بھی ادب پارے کی دلچسپی کا باعث اس کا موضوع رہا ہے۔ فن جتنا بھی خالص ہو لیکن ادب پارے کا موضوع دلچسپ نہیں تو اس پارے کی اہمیت نہیں یا اسے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم موضوع کی تعریف یوں کرتی ہیں:

"موضوع کی تعریف قدرے مشکل ہے کہ یہ دوسرے عناصر کے برعکس جو ٹھوس شکل میں ہیں۔ تجریدی فارم رکھتا ہے، اس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے تاہم دیکھا نہیں جا سکتا۔"(۱)

اظہار ہر شخص کی بنیادی خواہش ہے۔ اس کے لیے وہ بنیادی طور پر شاعری جیسی صنف استعمال کرتا ہے۔ اس کائنات سے جب انسان کی تجسس نگاہ کا واسطہ پڑتا ہے تو ذہن میں کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ گویا وہ ان سوالات اور کائنات کی وسعت میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ان میں گم ہو کر بھی انسان کی بے قراری کو چین نہیں آتا۔ وہ ہر وقت ان سوالات کا تسلی بخش جواب پانے کی کوشش میں سرگرداں رہتا ہے۔ انسان اور کائنات کا رشتہ روز آفرینش سے ہی قائم دائم ہے۔ اردو ادب میں دکنی دور سے ہی ایسے ادب کا سرمایہ موجود ہے جس میں خدا، کائنات، فرشتوں اور انسانوں کے متعلق مختلف دقیق اور خشک فلسفیانہ موضوعات کو سمیٹا گیا ہے۔ جدید شعراء نے بھی اپنی نظموں میں کائنات اور خدا کے تعلق کو بیان کیا ہے زیر مطالعہ نظمیں تمثیل، تراش اور نوحہ گر بھی اس موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔ اب باری باری زیر بحث نظموں کے موضوعات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

الف: نظم نوحہ گر کے موضوعات کا تجزیہ

شہزاد نیئر نے اپنی شاعری کا آغاز آزاد نظم سے کیا۔ ان کی نظموں میں مختلف النوع موضوعات ہیں اور ان کی نظمیں ان کے جذبات کی بے خوف آواز ہیں۔ شہزاد نیئر نظم نوحہ گر میں کائنات کی تخلیق اور انسانی تاریخ کو بے نقاب کرنے میں مصروف ہیں۔ اس نظم میں تخلیق کائنات، تخلیق آدم، انسانی شعور، مختلف تاریخی واقعات، انسان کے ارتقا کی تاریخ، تصور موت، قتل وغارت، جبر، نابودیت، نوحہ گری، تصور وجودیت، تصور غم اور انفرادیت سے اجتماعیت تک کی آواز کے تمام موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ راقمہ نے زمانی اعتبار سے ان میں موجود متذکرہ بالا موضوعات کا تجزیہ کیا ہے۔

بقول یوسف حسن:

"شہزاد نیر کے موضوعات شخصی محبت سے لے کر طبقاتی، قومی اور عالمی مختلف سطحوں کی سماجی آفاقیت تک پھیلے ہوئے ہیں اور وہ مکانی اور زمانی دونوں جہات میں دور تک دیکھنے اور جاننے کے لیے متجسس نظر آتا ہے۔"(۲)

نوحہ گر کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں:

آغاز آفرینش:

نظم میں شاعر نے وقت کی زبانی اس کائنات کے وجود میں آنے اور زمین پر زندگی کے آغاز کے حوالے سے واقعات بیان کئے ہیں۔ نظم نگار کہتا ہے کہ پہلے خلا میں کوئی وجود نہ تھا ہر طرف اندھیرا خالی پن اور تاریکی تھی پھر اچانک کچھ نہیں سے بہت کچھ وجود میں آیا۔ شعری اقتباس ملاحظہ ہو:

نہ ہونے کی بے جسم آغوش میں
بے زمانی کے پہلو بچھے خالی پن میں۔۔۔
کچھ بھی نہ تھا[۳]

تخلیق کائنات:

شہزار نیئر نے تخلیقِ کائنات کی بنیاد بگ بینگ تھیوری اور سٹیفن ہاکنگ تھیوری کو قرار دیا یعنی کائنات کی تخلیق کے بارے میں ان کا نکتہ نظر سائنسی ہے۔ بگ بینگ تھیوری کے مطابق ابتدا میں کائنات ایک عظیم گولے کی صورت میں تھی جس کا درجہ حرارت بہت زیادہ تھا جب اندرونی درجہ حرارت مزید بڑھا پھر ایک دھماکہ ہوا جس کے چیتھڑے فضا میں بکھر گئے دھماکوں کا یہ سلسلہ جاری رہا جس سے کائناتی اجسام بنتے رہے۔

بس اک لمحے کا پھسلاو
سمت آشنا غیر مادے سے ٹکراو
نقطے کا پھیلاو ہونے میں بدلا
تو کچھ وقت تھا۔۔کچھ جگہ[۴]

یونانیوں کا کائنات کے بارے میں نظریہ ہے کہ یہ کائنات چار عناصر ہوا، پانی، مٹی اور آگ سے بنی ہے۔ شاعر اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہے۔ اسی طرح سٹیفن ہاکنگ کی تھیوری کو موضوع بحث بنائے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات جب سے بنی تب سے غبارے کی نشو نما کی طرح مسلسل پھیل رہی ہے۔ پہلے ساری کائنات ایک نقطے میں سموئی ہوئی تھی پھر ایک عظیم دھماکے کے بعد اس کا وجود عمل میں آیا۔ تب سے وقت کا آغاز ہوا اس سے قبل وقت کی تشریح نہیں کی جاسکتی کیونکہ غیر متغیر کائنات میں وقت کے آغاز کائنات کے

باہر سے یہ مسلط کیا جا سکتا ہے۔ ایسی کائنات جو تغیر سے عاری ہو اس میں آغاز کی کوئی طبعی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ بقول دانیال طریر:

> "یہ نظم سائنسی تعقلات کے تناظر میں تخلیق کائنات کے عمل سے آغاز کرتی ہے اور اس کے بعد اساطیر کی روشنی میں انسانی تہذیبی سفر کو کہیں سائنسی کہیں مادی جدلیت اور کہیں خالص تخیلاتی تناظر میں شعری قالب میں ڈھالتی چلی جاتی ہے اور استعارے اپنی معنویت کو اسی فکری پس منظر کی تحدیدات میں ڈھالتے محسوس ہوتے ہیں۔"(۵)

تصور وقت:

کائنات اور اس کے مظاہر کے بارے میں ہر دور کا انسان سوچتا رہا کہ یہ کائنات کیسے اور کب وجود میں آئی۔ کائنات کہاں سے وجود میں آئی؟ یہ ایسی کیوں ہے؟ انسان کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات آتے ہیں۔ کیا اس کائنات کا خالق ہے؟ کیا وقت پیچھے کی طرف چل سکتا ہے؟ یہ کائنات کب ختم ہو گی یا یوں ہی چلتی رہے گی؟ انسانی تجربے کے مطابق وقت ایک ایسے بہاؤ کا نام ہے جس کی رفتار ناقابل فہم ہے۔

بقول ڈاکٹر محمود علی سڈنی:

> "محض عدم سے فضا کے وجود میں آنے کا خیال ایسا نازک ہے کہ بہت سے لوگ اس کے سمجھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ بالخصوص جب وہ ایسے تصور کے عادی ہوں کہ فضا کچھ نہیں ہے لیکن طبیعات دان فضا کو بجائے خلا محض ایک میڈیم سمجھتے ہیں ان کی نظر میں عدم سے مراد وہ حالت ہے جہاں نہ مادہ ہو اور نہ فضا ہو۔ اس نظریے میں اور بھی حیرت انگیز واقعات مخفی ہیں۔ فضا اور وقت آپس میں بری طرح الجھے ہیں جس طرح فضا پھیلتی اور سکڑتی ہے یہی حالت وقت کا ہے۔ بگ بینگ سے جس طرح فضا پیدا ہوئی اس طرح وقت کا بھی آغاز ہوا۔"(۶)

شہزاد نیئر بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ بگ بینگ دھماکے کے ساتھ ہی وقت کا بھی آغاز ہوا۔

وقت بہتا رہا
میں وہیں تھا
مجھے ادھ کٹے جسم گننے کی تفویض تھی(۷)

نوحہ گر کائنات کے آغاز سے اب تک کے تمام مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ نظم نگار وقت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وقت ہمارے زخم بھرتا ہے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے انسان پرانے زخم بھول جاتا ہے۔ یہ کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے لیکن یہ ہمیں دیکھ سکتا ہے۔ نوحہ گر ایک خیالی کردار ہے وہ تاریخ کے دشت میں شدت غم بیان کر رہا ہے۔ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ وقت کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا۔ جو لوگ میرے ساتھ آئے ہیں اور مجھ سے تاریخ انسانی سن رہے ہیں ایک ہو جاؤ۔

سار بانو! شتر روک لو
کاروانو! یہی دشت ہے
دائیں بائیں نہ آنکھیں مسافت کریں
تم مجھے دیکھ سکتے نہیں(۸)

یہی تو وہ گر یہ ہے جو انسان کو اپنی اصل سے روشناس کراتا ہے اور اسی وقوع کے لیے نوحہ گر تخلیق ہوئی۔

تواریخ کا مشاہداتی مظاہرہ:

شہزاد نیئر نوحہ گر میں قدیم سے جدید تک کے تمام مظاہر کا مشاہدہ بخوبی کرتے ہیں۔ یہ نظم قدیم سے جدید تک کا سفر نامہ ہے کیونکہ نظم میں ایک جانب نوحہ پڑھا گیا جو کہ بغاوت کے ساتھ حق کے امکان کے ایک واضح ثبوت ہے تو دوسری جانب ترتیب تواریخ کو خاص توازن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ زیر بحث نظم میں تواریخ کا مشاہداتی مظاہرہ ایسے کیا گیا ہے جیسے شاعر کن سے اب تک کے مراحل کے عینی شاہد ہوں۔ انسان کی پیدائش سے لے کر دور جدید تک تمام حالات کو جس مہارت سے انہوں نے نظم میں قلمبند کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے انسانی تاریخ و تہذیب کے کئی سفاک رویے ہمارے سامنے پیش کیے۔

سعید ابراہیم کے خیال میں:

> "شہزاد نیئر کی طویل نظم نوحہ گر ان کے رچے بسے تاریخی اور عصری شعور کا باکمال شاعرانہ اظہار ہے۔ جس میں انہوں نے کمال مہارت بے قید وقت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔"(۹)

انسانی قتل وغارت:

شاعر اپنے حالات وواقعات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کا ہر شعر معاشرے میں بسنے والے افراد کے دل کی آواز ہوتا ہے۔ یہ اپنی شاعری سے دنیا کی عکاسی کرتا ہے۔ زیر بحث نظم نوحہ گر میں شاعر کا کردار قدیم سے جدید دور تک کی تمام قتل وغارت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نوحہ گری کرتا ہے کہ کیسے انسان نے انسان کو کبھی خود غرض بن کر کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی خدا کے نام پر قتل کیا۔ تاریخ گواہ ہے مسلمانوں نے جب ایران، شام اور مصر پر حملہ کیا تب کئی لوگ جان کی بازی ہار گئے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کو سپین اور ترکی میں قتل کیا، ہندووں نے بدھ مت کا قتل کیا۔ بدھ مت نے برما میں مسلمانوں کا قتل کیا۔ اسی طرح صلیبی جنگوں میں کئی لوگ مارے گئے۔

بہت قتل ہوتے رہے
لوگ میرے ترے نام پر
قتل کرتے رہے قتل ہوتے رہے۔۔
تیرے چرنوں پہ چڑھتے چڑھاوے لہو رنگ ہیں[۱۰]

شہزاد نیئر مختلف زمانوں میں انسانوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر دردناک انداز میں کرتا ہے۔ ہندو مذہب میں عورتوں کو شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جلا دیا اور کمزور ہونے کی وجہ سے بدلہ لینے کی غرض سے جلا دیتے۔ وہ خدا جسے دیکھا نہیں جاسکتا تھا اس پر ہزار خدا بنے بیٹھے تھے جو عورتوں کو ظلم کا نشانہ بناتے تھے ۔ خدا کے نام پر سب نے اپنا اپنا مذہب بنا رکھا ہے ۔ ہر ایک مذہب دوسرے مذہب کا خاتمہ اور اسے اپنے مذہب، عقیدہ میں لانا چاہتا ہے اور جو آنے سے انکار کرتا ہے تو اسے قتل کر دیتے۔

سو وہ تلوار کی نوک پر حکم لکھتے چلے
سارے منکر سروں کو اڑاتے ہوئے[۱۱]

سعید ابراہیم کی اس نظم کے بارے میں رائے ہے کہ:

> "یہ نظم کہانی ہے نیستی سے ہستی ہونے کی اور پھر اس ہستی کے بستی بسانے کی خوف کی زمین سے دیوتاؤں کی فصل اگانے اور دیوتاؤں کو ایک خدا میں سمانے کی اور پھر آباد بستیوں کو مذہب کے نام پر برباد کرنے کی۔"[۱۲]

نابودیت:

نابودیت یعنی non _existence ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جس میں اشیاء ناموجود سے وجود میں آتی ہیں یا اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔ یہ موت کے بعد مکمل فنا پذیری کا نظریہ ہے جس کے مطابق انسان مکمل طور پر فنا ہو جائے گا۔ یعنی انسان کا جسم اور روح دونوں مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔ اصل میں یہ اخلاقی اور علم الکلامی شکوک و شبہات کا فلسفہ ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے آراء ہیں۔ عیسائی موت کے فیصلے کے بارے میں کہتے ہیں کہ پرہیز گاروں کی روحیں بہتر جگہ پر رہتی ہیں جبکہ ظالم لوگ اس سے بھی بدتر حالت میں ہوتے ہیں اور فیصلے کا انتظار کرتے ہیں۔ بعض لوگ جو اللہ کے لائق نظر آتے ہیں وہ کبھی نہیں مرتے لیکن دوسروں کو اس وقت تک سزا دی جاتی ہے جب تک خدا چاہتا ہے کہ وہ موجود ہیں اور انہیں سزا دی جائے۔

نوحہ گر میں شاعر نے نابودیت کی اصطلاح استعمال کی ہے جب وہ تخلیق کائنات اور تصور موت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جیسے کہ نیستی سے ہستی کا وجود میں آنا اور ایٹم بم کی تباہی سے کائنات کے خاتمے اور نا پید کی طرف اشارہ کرنا یعنی وجود کو نابود کرنا نابودیت کی مثالیں ہیں۔

نہ ہونے کی بے جسم آغوش میں
بے زمانی کے پہلو بچھے خالی پن میں
جہاں بے جہت لامکاں پر
کوئی لاشی راج کرتی تھی
کچھ بھی نہ تھا
روشنی، تیرگی، سمت آواز۔۔۔۔سب نیستی!
بے وجودی کے معدوم سے
"کچھ نہیں" کی عدم دوش چوٹی سے
بس ایک لمحے کا پھسلاؤ
سمت آشنا غیر مادے سے ٹکراؤ
نقطے کا پھیلاو ہونے میں بدلا[۱۳]

انفرادیت سے اجتماعیت کی آواز:

زیر بحث نظم میں شاعر نے نوحہ گر کردار اجتماعی انسانی ضمیر کے لیے لیا ہے۔ یہ ایک صدا ہے جو سنائی دیتی ہے اور ضمیر کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے شاعر نے انسان کی بھیانک تاریخ رقم کی ہے۔

کسی ہاتھ میں نوحہ گر کا قلم ہلا
خون آدم کی تاریخ لکھتا رہا
ہر ورق پر لہو جھلملاتا رہا(۱۴)

ان تینوں مصروں میں پوری انسانیت کے ساتھ بیمانہ سلوک کی روداد رقم کی گئی ہے۔ یہ شاعر کے مطالعاتی اور مشاہداتی ہنر کا نادر نمونہ ہے۔ نوحہ گر کردار بیک وقت قدیمی بھی ہے اور نوحہ گر بھی۔ اس کی ایک حیثیت متشلک ناظر کی ہے اور دوسری شاعر کی۔ ایک برابر تجزیے میں مصروف ہے اور دوسری برابر ماتم میں۔ اس دوہری کیفیت نے پوری نظم کے تاروپو کو تشکیل دیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس نظم کا فکری مواد شعری قالب میں ڈھلتا محسوس ہوتا ہے۔ نوحہ گر ایک علامتی کردار ہے۔ یہ قتل و غارت کو پسند نہیں کرتا۔ جب انسان انسان کا قتل کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے اور وہ نوحہ کرتا ہے۔

رجائیت:

نظم میں رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ماضی کے تلخ واقعات شاعری میں بیان کرنے کے بعد شہزاد نیرؔ نظم میں پر امید ہیں انہیں ایک بہتر وسائل اور بربریت سے پاک زندگی کی امید ہے اور یقین ہے کہ ایک دن دنیامیں امن قائم ہو گا۔ شیز ادنیرؔ انٹرویو میں بتاتے ہیں:

"امید کا انسان کے داخلی نظام پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر امید کی کوئی کرن نظر آجائے تو مایوسیوں کی دلدل میں دھنسا انسان ایک دم سے زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اس میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے اور اداسی کی برف پگھل جاتی ہے۔"(۱۵)

نظم کے آخری حصے میں شاعر پر امید نظر آتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں

پھر مجھے منتظر بیٹھنا ہو گا

پیچیدہ ہوتی ہوئی اتنی انواع میں
کون جوڑے اقدام ایک اوپر دھرے
سوچنے کا پھر اک بار آغاز ہوا![۱۶]

ڈارون تھیوری کے مطابق مختلف species کے درمیان بقا کی جنگ وہی جیت سکتا ہے جو قدم بہ قدم ترقی کرے یا دوسروں سے خود کو بہتر بنانے کے لئے آگے بڑھتا جائے۔ نظم نگار بھی یہاں یہی کہہ رہا ہے کہ سب سے پہلے میں جانتا ہوں کہ ایٹمی دور آگیا تو پتھر انسان صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔ تھوڑی مخلوقات ہی باقی رہیں گی اور ایک بار پھر ارتقا ہو گا۔ شاعر کہتا ہے کہ جنگ وجدل چھوڑ دو یہ نہ ہو کہ سب مٹ جائے اور تہذیب انسانیت ایک بار پھر وہاں چلی جائے جہاں سے انسان کا ارتقاء ہوا۔

مجھے علم ہے، راکھ ہو جائیں گے
سب زمیں وزماں۔۔۔۔[۱۷]

نوحہ گری:

شہزاد نیئر کہتے ہیں کہ انسان نے غاروں سے اپنے رہن سہن کا آغاز کیا اور پھر وقت کے پہیے نے انہیں ایسا گردش میں ڈالا کہ غاروں سے تہذیب یافتہ زندگی میں بھاگتا بھاگتا انسان ظاہری نمائش کی دلدادہ تہذیب مادی آسائشوں اور مرحوم آرزوں کی چاہ میں انسانیت کے رتبے سے گر جاتا ہے۔ ان سب پر نظم کا کردار نوحہ کرتا ہے اور کیونکہ وہ ان حالات وواقعات کا عینی شاہد ہے ۔ جلیل عالی ان کی شاعری کے بارے میں بتاتے ہیں:

"اس کی تخلیقات میں موجود کسک احساس دلاتی ہے کہ شاعری اس کی پہلی ترجیح ہے وہ
شاعری کرتا نہیں دل پر اتری شاعری کو کاغذ پر اتارتا ہے۔"[۱۸]

زیر بحث نظم میں شاعر کا کردار نوحہ گر نوحہ گری کرتا ہے. وہ اپنے تن پر لگے زخموں کی گنتی کرتا ہے اور ان زخموں کی چارہ گری کے زمرے میں آوازہ حق کا نوحہ بھی بلند کرتا ہے۔ جہاں جہاں قتل وغارت کا منظر نظر آتا ہے وہاں نوحہ گری کرتا ہے۔ شاعر اس قتل وغارت کو دیکھ کر روتا ہے اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے کیونکہ وہ قتل وغارت کو پسند نہیں کرتا۔

جوش گریہ! دباؤ بڑھا!۔۔
اشک سیلاب تھے، بہہ پڑے

سنگ آنکھیں بہاتے ہوئے نوحہ گر بہہ پڑا[۱۹]

تصور خدا:

شہزاد نیئر نے نظم میں تصور خدا کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کائنات کی رنگینیاں، اس کی وسعتیں اور خوب صورتیاں ہمیشہ سے انسان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں جو بھی اس عظیم کائنات کے روبرو آن کھڑا ہوتا تھا ڈراڈرا سا اور سہا سہا سا تھا۔ یہ ڈراڈرا انسان ہر بات سے ڈر جاتا تھا اور جس سے ڈر جاتا اسے خدا یا دیوتا کا درجہ دے کر اس کی پوجا شروع کر دیتا اور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان جب چوپایہ سے دو ٹانگوں پر کھڑا ہوا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا تو اس انسان کو ہر چیز سے خوف آتا تھا۔ خوف سے بچنے کے لیے خدا کا تصور بنایا، مرد کو مذکر بنایا طاقت رکھتا تھا کہیں پکڑ میں نہ آجائے اسے آسمان پر بٹھایا۔

یہاں سے وہاں
جس قدر طاقتیں بھی میسر ہوئیں
سب اسے سونپ بیٹھے۔۔۔ تو ڈرنے لگے
ماننا ہو تو وحشت بھری آنکھ کو کوئی پتھر خدا ہے[۲۰]

اگر مذہبی حوالے سے دیکھا جائے تو خدائی وجود کے اعتقاد کا انسانی نظریہ اور رویہ اس کے ختم اور اس پر انحصار کو جس خوبصورتی سے حوالہ نظم کیا ہے وہ ایک الگ رجحان ساز کارنامہ ہے۔ انسان کا تمام مذہبی تبدیلیوں کو خدا کی بجائے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا کرب ناک عمل ہے جس سے شاعر صرف نظر نہ کر پائے۔

دانیال طریر اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "یہ نظم خدا کو ایسا لفظ قرار دیتی ہے جس کے گرد پہلے انسان خود عقیدت اور عقیدت کا ہالہ بناتا ہے۔ اور پھر اس عقیدے اور عقیدت کی آڑ میں زر اور زمیں کی ہوس میں انسانی بقا کے ساتھ وہ جابرانہ اور سفاکانہ کھیل کھیلتا ہے جسے تاریخ اپنے تمام تر کوششوں کے باوجود دبانے اور چھپانے میں ناکام نظر آتی ہے۔"[۲۱]

تاریخی واقعات:

شاعر نے بھیانک تاریخ انسانی کو بیان کرتے ہوئے تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جس میں آدمی کا زمین پر پہلا قتل، طوفان نوح، واقعہ کربلا اور بنی اسرائیل کے قبیلوں کا تذکرہ کر کے انسانیت کی تذلیل کے دردناک مناظر کو پیش کیا ہے۔

آسمانوں کی قاتل روانی کا ہتھیار پانی
تنفس کا آزار۔۔۔۔پانی
مجھے یاد آتی ہے پانی کی وہ حکمرانی
کہ جس میں سبھی خشک لکڑی بنے(۲۲)

شاعر کے دل میں باطل کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں۔ واقعہ کربلا کا بیان مختلف علامتوں کے پیرائے میں کیا گیا ہے۔ جب نوحہ گر فرقوں میں مذہب کے نام پہ قتل وغارت کے مناظر کو دیکھتا ہے تو اس کا دل خون کے آنسو روتا ہے اور یہ نوحہ خوانی میں مصروف بڑھتا جارہا ہے۔

جلیل عالی شہزاد نیئر کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"ایک اصل تخلیق کار صرف اظہار کو کافی نہیں جانتا۔ فنکارانہ اظہار پر یقین رکھتا ہے۔ یہی دھن شہزاد نیئر کا اصل سرمایہ ہے اسے اپنی بات کہنے کا جنون ہے۔ اسی جنون کے سبب اس کے شعری اسلوب کے خدوخال نکھرتے ہیں۔"(۲۳)

لفظ مشائی خاص ارسطو کی ذات سے منسوب ہے اور بتاتا ہے کہ اس نے کس طرح چلتے پھرتے فلسفہ فنون اور علوم کی ترسیل میں زندگی صرف کی تھی۔ ارسطو سکندر اعظم (شہزادہ) کا استاد تھا شہزادے کو تعلیم دی گئی کہ قتل وغارت نہ کرے اور امن کی زندگی گزارے پھر بھی وہ قتل وغارت کرتا رہا۔

وہ جو شہزادگی ورغلاتا رہا
چلتے پھرتے رہے
جابجا تخم حکمت گراتا رہا(۲۴)

شہزاد نیئر بنی اسرائیل کی قوم کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی پسندیدہ قوم تھی ان پر ظلم و ستم ہوئے۔ بابل کا بادشاہ بخت نصر یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا اس کی یاد میں نوحہ گر گریہ زاری کر رہا ہے۔ شاعر نے جب تیز گھوڑوں کے پیچھے قیدیوں کو سنا تو اس نے رونا دھونا شروع کر دیا۔

تند گھوڑوں کے پیچھے گھسٹتے اسیروں کو سنتا ہوا۔۔۔
ان لاڈلوں کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا[۲۵]

تخلیقات کا عمل:

شہزاد نیئر زمین، پانی، زندگی اور کائنات کی تخلیقات کا ذکر کرتے ہیں۔ شاعر کے مطابق انسان خلا میں پہلے سے کہیں موجود تھا۔ خالی پن سے اچانک آسمان نکلا اور خلا سے فضا کا عمل تخلیق ہوا۔ انسان یہ سب کچھ خلا میں دیکھ رہا تھا۔ شاعر کہتے ہیں کہ کائنات کا اصل انسان ہے اور کائنات اصغر اس میں پوشیدہ ہے۔ انسان دیگر مخلوقات کی طرح چار عناصر سے بنا ہے جن میں آگ، پانی، مٹی اور ہوا شامل ہیں۔ ان اجزاء کا بکھر جانا موت ہے۔ چکبست نے خوب کہا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

نظم میں تخلیق کے عمل کے بعد خیالی کردار جو صدا ہے اپنا تعارف کرواتا ہے میں قدیمی ہوں۔۔ مجھ سے سنو۔ درحقیقت یہ ایک آواز ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے ڈھلانوں، راستوں اور گھائیوں سے ٹکراتی ہوئی سات جانب چلی۔ شاعر کی گولہ مراد زمیں ہے جسے آتش زنی کی خبر نہ تھی۔ یہاں کئی سانحات رونما ہوئے جس سے لوگ خوفزدہ ہوگئے۔ شاعر نے زمیں کے اوپری حصے کو انسانی کھال سے تشبیہ دی ہے۔ یہ زمیں کے اندر پگھلے مادے کی حفاظت کرتی ہے۔ دھماکے کے بعد درجہ حرارت بہت زیادہ تھا جس وجہ سے کوئی چیز اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی تھی پھر آہستہ آہستہ زمین ٹھنڈی ہوتی گئی اور اتنی زیادہ ٹھنڈی ہوگئی کہ ہر طرف برف جم گئی پھر زندگی کا وجود برقرار رکھنا ممکن نہ تھا۔ زندگی کے ظہور کی بنیادی شرط یہ تھی کہ کیسا درجہ حرارت ہو جس پر اشیاء مائع حالت میں موجود برقرار رکھ سکیں۔ اس سلسلے میں سائنسدانوں نے BIOGENESIS اور A _ BIOGENESIS کا نظریہ پیش کیا۔ شاعر زندگی کے وجود کو بیان کرتے ہوئے اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ زندگی سب سے پہلے سمندر میں پیدا ہوئی۔ جب سمندر میں جانور

پیدا ہوئے تو پھر ساحل کی طرف جانے لگے یہ ان کا آبائی گھر تھا۔ سمندر میں انہیں اماں ملتی تھی۔ کنارے پر آتے تو خوف محسوس کرتے یوں زندگی کی ابتدا ہوئی۔

نامیاتی ازل سے ابد کی طرف جل تھلی رینگتے تھے
اگر کوئی لمحہ ڈراتا تو پھر بہہ نکلتے
قدیم اک مسکن کی جانب
جہاں کی ہر اک لہر ماں تھی اماں تھی[۲۶]

انسان کے مہذب ہونے کے مدارج:

جب انسانی زندگی شروع ہوئی تو انسان کے پاس علم و ہنر نہیں تھا بلکہ شعور تھا جو اسے ذات خداوندی نے بخشا تھا جس کے استعمال سے انسان نے دنیا میں زندہ رہنے اور اپنے لئے آسانیاں پیدا کرنے کے طریقے ایجاد کیے۔ دنیا میں قدم رکھتے وقت نہ انسان بولنا جانتا تھا نہ چلنا اور نہ ہی کسی فن اور ہنر سے واقف تھا بلکہ یہ تمام کام اس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ضروریات کے پیش نظر کیے۔ اس نے بولنا سیکھا، شکار کرنا اور زندہ رہنے کے لئے اناج اگانا سیکھا اور پھر اتنا سمجھدار ہوشیار ہو گیا کہ تخلیقات کا عمل شروع ہو گیا۔ ڈارون تھیوری کے مطابق تخلیق انسانی ایک مسلسل تبدیلی کا نتیجہ ہے جیسا انسان ہمیں آج دکھائی دیتا ہے وہ ہمیشہ سے ویسا نہیں ہے بلکہ مسلسل تبدیلیوں کی زد سے آج اس حالت پر پہنچا ہے۔ اس کی فطرت میں یہ بات انتہائی شہرت کو پہنچی کہ انسان بندر کی ارتقائی شکل ہے۔

پھر ایک بار چھوٹوں نے دھرتی بسائی
اور ان میں سے دو چار نے
اگلے پیروں کو ہاتھوں میں بدلا
لرزتے ہوئے ایستادہ ہوئے[۲۷]

شاعر بھی انسان کو دیگر حیوانات کی طرح ایک ارتقائی عمل میں کامیابی حاصل کر لینے والے جاندار کے طور پر دیکھتا ہے۔ ایسا جاندار جس نے دیگر جانداروں کی نسبت اپنے ماحول سے بہتر مطابقت اختیار کی اور دوڑ میں دیگر جانداروں سے آگے نکل گیا۔ جانداروں کے جینز میں ہلکی پھلکی تبدیلیاں ہوتی ہیں ان تبدیلیوں

کے تسلسل سے ایک نئی نسل پیدا ہوتی ہے جو پچھلے سے مختلف ہوتی ہے اور طاقتور ہوتی ہے۔ وسائل کے حصول کے لیے یہی نئی نسل کامیاب ہوتی ہے باقی فنا ہو جاتی ہے۔

نجانے ہوا میں، زمین کی گھنی خاک خشکی میں
کیسی کشش تھی کہ بڑھنے لگی
ساحلوں سے پرے ہو کے قامت نکالے
اور اتنے کشیدہ
درختوں پہ جھک کر بدن پالتے تھے(۲۸)

انسان پہلے جو پایہ تھا۔ ابتدائی انسان جسمانی ساخت کے لحاظ سے مختلف تھا۔ جھک کر چلتا تھا سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ آسمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگا ہم کو مٹی نے پیدا کیا۔ ابتدائی دور میں لوگ غاروں میں رہتے تھے اور انہیں جانوروں کی طرح اپنی غذا حاصل کرنے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ غذا کی تلاش میں جنگلوں میں بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی۔ قدیم انسان جانوروں کا شکار کر کے کچا گوشت کھاتا تھا اور پتھروں سے اوزار بناتا۔ انسان ایک سوشل مخلوق ہے زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اس نے بہت کچھ سیکھا اور اسے دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے میں خوشی محسوس ہوتی۔ اس نے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے زبان کی ایجاد کی۔

کنڈ مسکن کیے آگ چکھی
درونی تپش سے الاؤ جلائے
جہاں جانور نرم ہوتے رہے
پھر بھی اندر کوئی بھوک تھی(۲۹)

ایک پتھر کو دوسرے سے رگڑا تو چنگاری پیدا کی جس نے قریب پڑی گھاس کو جلا دیا۔ اس واقعے کے گہرے مشاہدے نے آگ کی ایجاد کی طرف ابتدائی انسان کی رہنمائی کی۔ ابتدائی انسان نے بیج کو گیہوں، چاول اور جو وغیرہ کو زرخیز مقامات پر پیدا کرنا سیکھا۔ قدیم انسان نے عرصہ دراز تک گھاس کے بیج کو کھانے کی حیثیت سے استعمال کیا پھر سیکھ لیا کہ بیج بو کر فصل اگائی جا سکتی ہے۔

پھر گھنے جہل کی تیرگی سے پرے

جاننے کا نیا پل چکھا آنکھ پر دہ ہٹا[۳۰]

انسان نے فطرت کی قوتیں خود مسخر کر لیں خود علاج خود مشاہدہ کرتا ہے۔ نوحہ گر کہتا ہے کہ چوپایہ سے دوپایہ والا انسان اتنا ایڈوانس ہو گیا کہ خلا میں جا کر میزائل پھینکنے لگا ہے۔ پھر فطرت ظالم ہوتی گئی اور ہمارا بس نہ چلتا تھا اب ہم نے فطرت پر فتح پائی اور اپنے لیے آسائشیں بنالیں۔

میری سوچوں تلے آ گئے
وہ جو قاتل جراثیم تیری خدائی میں
تہذیبیں کھاتے رہے[۳۱]

انسانی تہذیب کی اہم کروٹوں کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے خاص طور پر ستر پوشی جنسی جبلت اور تخلیق کے اولین احساسات کو جس طرح اختصار سے دو مصرعوں میں پیش کیا وہ شاعر کی ہنر مندی کی دلیل ہے۔

تصور وجودیت:

ہستی کا عدم سے وجود میں آنا اور پھر وجود کا لگاتار بڑھتے چلے جانا وجودیت کہلاتا ہے۔ درحقیقت کائنات کا وجود میں آنا یا مترشے ہونا وجودیت ہے۔ دوسرے نظریہ ہائے فکر کی طرح یہ اپنا سائنسی وجود رکھتی ہے جو تہذیبی روایتوں کو ان کی مخصوص حالتوں میں ایک خاص شکل دیتی ہے پھر اسی کے ذریعے مدعا بیان کرتی ہے۔ خالد اقبال یاسر وجودیت کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: "وجودیت انسان کی فطری تخیل کی رفعت کا ادراک نہیں رکھتی اور صرف اور صرف اس کی تباہی اور بربادی کی داستان سناتی ہے۔"[۳۲] اس میں انسانی وجود، اس کی اہمیت اور انسان کا کائنات سے تعلق کی بات مختلف نظریات ور تصورات میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ بحث شروع سے ہے کہ کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے یا انسان کو کائنات کے لیے بنایا گیا۔

لاوجودی چٹانوں کے پھیلے ہوئے کالے پن میں
زمان و مکاں سے لتھڑے ہوئے
آسمان، کہکشائیں، زمینیں
توانائی، مادے کی تجسیم میں۔۔۔۔
دیکھتا تھا نہونے سے ہونا[۳۳]

تصور غم:

دکھ درد انسانی زندگی کا لازمی جزو تصور کیے جاتے ہیں۔ غموں کی بدولت انسان زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی میں غموں کا سامنا رہتا ہے۔ شہزاد نیئر چونکہ شاعر ہیں وہ زندگی میں غم کو حقیقت خیال کرتے ہیں۔ کیفیت غم کے متعلق شہزاد نئیر کا کہنا ہے کہ

> "غم خوشی سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے کیونکہ غم دائمی ہوتا ہے انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتا، غم کے لمحات گزر جانے کے بعد بھی اثرات چھوڑ جاتے ہیں اور ایک یاد بن کر باقی رہ جاتے ہیں۔ اس کیفیت سے انسان میں طاقت پیدا ہوتی ہے جس سے اس کا غرور ٹوٹ جاتا ہے، غم عاجزی پیدا کرتا ہے اور اس سے دوسروں کے لیے احساس پیدا ہوتا ہے جب کہ غم کی نسبت خوشی عارضی ہوتی ہے کچھ پل کے لیے آتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے۔"(۳۴)

شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم میں غم کی شدت واضح نظر آتی ہے۔ غم کا فلسفہ انہوں نے یوں بیان کیا ہے:

شوخ قوس تبسم میں پلتے ہوئے
بے بصر زندگی کے طرب زا خیالو!
تعیش کے امروز میں سانس لیتی ہوا و!
ذرا ہٹ کے بیٹھو(۳۵)

وہی شاعری اپنے زمانے کی نمائندہ شاعری کہلاتی ہے جو اس دور میں لکھی جانے والی شاعری سے منفرد ہو۔ شہزاد نیئر کی شاعری میں زندگی کے مسائل جدید سائنس اور مشین ایجادات کے ایک کردار کے طور پر موجود دکھائی دیتے ہیں۔ اس کردار کی آنکھیں جگہ جگہ انسانی غم سے غم ناک ہیں۔ نظم نگار کہتا ہے کہ میرے انسان مذہب اور تیرے نام پہ مرتے رہے اور تو آرام سے دیکھتا رہا۔ انسان نے جو خدا بنایا وہ اس کی بھول تھی اس نے غلط کیا کیونکہ وہ مذہب کی بنا پر انسانیت کا قتل کر رہا تھا۔ اس نظم میں جس جدت فن کا مظاہرہ کر کے لفظی اور عنوان سے پیوستہ مصرعہ سازی کی گئی ہے اس سے کہیں زیادہ جدیدیت کے ماخذ سے ایک ایسا تخیلاتی شاہکار تخلیق کرنے میں شہزاد نیئر کامیاب رہے ہیں جس کی مثال ملنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شہزاد نیئر نے بڑے سلیقے سے کرافٹ اور پلاٹ سے انصاف کیا ہے جس کی بنیادی عوامل کو اس

خوش اسلوبی سے اظہار یہ دیا ہے کہ لگتا ہے واقعی یہ تمام عوامل انہوں نے اپنے احساس کے باطنی رخ پر نہ صرف محسوس کیے بلکہ ان سے خاطر خواہ نتائج اخذ کرنے میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ یہ نظم ادب کے سنجیدہ قارئین سے مکالمہ کرتی ہے اسلوب اور خاص طور پر نفس مضمون کے لحاظ سے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

ب: نظم تمثیل کے موضوعات کا تجزیہ

علامہ اقبال کی شاعری کا زیادہ تر محور فکر و فلسفہ کے متعلق موضوعات ہیں۔ کائنات کے راز و امور کے متعلق جتنا شعور اقبال کی شاعری میں موجود ہے وہ کسی اور کے ہاں کہاں؟ جدید شعراء نے اس موضوع کو اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ خاور اعجاز کی زیر مطالعہ نظم بھی خدا، انسان اور کائنات کے تعلق کو بیان کرتی ہے۔ اگرچہ طویل نظمیں اردو میں کم ہی لکھی گئیں ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنی نوعیت کی منفرد نظم ہے۔

خاور اعجاز طویل نظم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں

> ”نظم مسلسل ہی ہوتی ہے لیکن اسے اخباری خبر کی مسلسل نہیں ہونا چاہیے۔ مختصر نظم ایک ٹکڑے پر منحصر ہو سکتی ہے لیکن طویل نظم میں ایسا نہیں۔ اسے ٹکڑوں میں لکھا جا سکتا ہے بعد میں چاہے یہ ٹکڑے علیحدہ نظر آئیں یا مربوط۔“(۳۶)

یہ نظم سات زمانوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے تمثیلی انداز اختیار کرتے ہوئے انسان کے مختلف زمانی ارتقا، خدا اور انسان کے درمیان تعلق کو زیر بحث لایا ہے۔ خاور اعجاز نے مختلف زمانوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے ذہن میں آنے والے خیالات اور سوالات کو شاندار امیجری کے ساتھ شعری صورت میں پیش کیا ہے۔ آنند کے خیال میں:

> ”خاور اعجاز کی یہ طویل نظم سات زمانوں (سات یکوں) پر مشتمل ایک مہا بیانیہ ہے جسے شاعر نے ایک مہاکاویہ کا روپ سروپ اس لیے اختیار نہیں کرنے دیا کہ اس نظم کی غرض و غایت وہ نہیں جس کے تحت کسی مخصوص اوتار، نبی یا قومی ہیرو یا فاتح کی زندگی کی داستان، اس کی بہادری کے قصے غلو آمیز شوں کے ساتھ بلند آہنگ ہاؤ ئیو کی ساتھ پیش کیے جاتے رہے ہیں۔“(۳۷)

خاور اعجاز کی شاعری میں تصورات کی تازگی اور اظہار کی ندرت نمایاں ہے۔ تلاش مسلسل تلاش ان کا مقصد ہے۔ یہ ایک گمشدہ کائنات کی تلاش اور اس کے اسرار کو بے نقاب کرنے میں مصروف ہیں۔ اس نظم میں تخلیق کائنات، تخلیق آدم، انسانی شعور، مختلف تاریخی واقعات، انسان کے ارتقا کی تاریخ، تصور خدا، انبیا اکرام کے تذکرے، قتل وغارت، جبر، نابودیت، نوحہ گری اور مختلف ادوار میں انسانی ترقی جیسے موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ راقم الحروف نے زمانی اعتبار سے ان میں موجود متذکرہ بالا موضوعات کا تجزیہ کیا ہے۔

آغاز آفرینش:

اس دنیا کے آغاز سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی آدم کا نور خدا کے پاس تھا۔ یعنی کائنات کی پیدائش خدا کے نزدیک اس دنیا میں حضرت آدم کو لے کر آنا تھی۔ شاعر نے نظم کا آغاز ابتدائی دور سے کیا ہے جب اس دنیا میں خاموشی طاری تھی۔ سیتہ پال آنند کے مطابق: ''پہلا زمانہ آفاق کے اس منظر نامے سے شروع ہوتا ہے جہاں لا ہے اور لا کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔''(۳۸)

اس کے بعد خدا نے لفظ ''کن'' کہہ کر کائنات کا آغاز کر دیا۔ بقول شاعر:

تری ابتدا ''کن'' کے عنواں سے ہوتی ہے
بے ہیت اک تیرگی کے سمندر سے
پہلی کرن روشنی کی گزرتی ہے(۳۹)

تخلیق کائنات:

انسان جب سے اس دنیا میں آیا ہے وہ کئی طرح کے سوالات اپنے ذہن میں رکھتا ہے اور ان کے جوابات کا متلاشی نظر آتا ہے۔ شاعر نے آغاز آفرینش سے لے کر تخلیق آدم اور پھر ہر زمانے کی مناسبت سے اسلامی شعور اور انسانی ترقی کے مختلف مراحل کو زیب قلم کیا ہے۔ اس منفرد نظم میں یہ تمام موضوعات نہایت دلچسپی کے ساتھ سموئے گئے ہیں۔ اس طویل نظم کو آغاز آفرینش سے شروع کیا گیا ہے۔ جب خدا نے یہ دنیا تخلیق کی۔ یہاں شاعر نے زمین اور آسمان کی آفرینش کو اسلامی اور سائنسی دونوں نقطہ نظر سے بیان کیا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق دنیا کا آغاز لفظ ''کن'' سے ہوا۔ شاعر بھی اس کی توثیق کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''لا'' کے صندوق سے

"کن" کا پرچم کھلا
ایک نیلی اڑن طشتری اس پہ ظاہر ہوئی(۴۰)

یہ نظم کن کی بگ بینگ سے شروع ہو کر ابتدائے آفرینش کو اپنی بنیاد بناتی ہوئی وقت اور فاصلے طے کرتی ہوئی نہ صرف چھ زمانوں کی ان گنت نوری سالوں کے عرصے طے کرتی ہے بلکہ ساتویں زمانے کی خبر رسانی کرتی ہے۔ جدید طبیعات کے مطابق کائنات کی ابتدا ایک بے انتہا چھوٹے اور کثیف ذرے سے ہوئی۔ جس کے پھیلاؤ نے کائنات کی تمام اشیا کو جنم دیا۔ خاور اعجاز نظم میں کائنات کی تخلیق میں بگ بینگ تھیوری کا ذکر کرتے ہیں۔

تخلیق کی پوٹلی
ایک ایٹم کی صورت بندھی تھی(۴۱)

کائنات میں پہلے کچھ بھی نہیں تھا اور پھر پروردگار کے "کن" کہنے سے ایک دھماکہ کے ساتھ ہی اس کائنات میں روشنی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات دراصل انسان کے لیے ایک بہترین ماحول بنانا چاہتی تھی۔ شاعر کے بقول شروع میں کائنات کی تخلیق سے پہلے یہاں اندھیرا تھا لیکن پھر جب خدا نے تخلیق آدم کا سوچا تو دنیا کو روشن کرنے کے علاوہ ہر قسم کی مخلوق اس میں چھوڑ دی تاکہ آدم کی دلچسپی کا سامان پیدا ہو سکے:

پھر کسی نے کہا: "روشنی"
روشنی ہو گئی
گنبدِ آسمانی چمکنے لگا(۴۲)

تخلیق آدم:

خدا نے زمین و آسمان کی تشکیل سے پہلے ہی آدم کا نور بنا دیا تھا جو خدا کے پاس ہی تھا۔ اللہ تعالی انسان کی عظمت کو قرآن مجید میں یوں بیان کرتے ہیں: "اور ہم نے نوع انسان کو قابل تعظیم بنایا"(۴۳) اللہ نے اس دنیا میں رونق پیدا کرنے کے لیے تخلیق آدم کی اور اسے فرشتوں سے سجدہ کروا کر عظمت بخشی۔ جس فرشتے نے سجدہ نہ کیا اس کو ملعون ٹھہراتے ہوئے اپنی بارگاہ اقدس سے نکال باہر پھینکا۔ پھر خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے اسے مٹی کا پیکر عطا کیا اور جنت میں ہی رکھا۔ اس نظم کے پہلے زمانے میں شاعر کا موضوع کائنات کی

تخلیق، حضرت آدم کا وجود اور پھر جنت میں اس کا رہنا ہے۔ شاعر کے مطابق حضرت آدم کی تخلیق سے پہلے ہی اس کا نور خدا کے پاس موجود تھا جو باغ عدن میں رہتا تھا۔

جب زمان و مکاں اور زمیں آسماں تک بھی مفقود تھا
تب بھی میں
تیرے پختہ ارادوں میں موجود تھا[۴۴]

پھر جب خدا نے انسان کو مٹی کا جسم عطا کیا اور اسے عملی طور پر جنت میں داخل کیا تو اس کا یہ پیکر اور حسن دیکھ کر جنت کا ہر قریہ مہک اٹھا اور ماحول سرشار ہونے لگا۔ پہلا زمانہ دنیا کی تشکیل اور تخلیق آدم کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ نظم کا نام ہی تمثیل ہے اس لیے اس میں کئی چیزوں کو مثلاً زمیں، آسماں، زمانہ اور خدا کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

عالم بے وجودی سے نکلا تھا
رات اور دن تو ابھی سو رہے تھے
جاگتا تھا ترے بے دروبست حجروں میں میں[۴۵]

ان مصروں میں عالم بے وجودی کی ترکیب سے خدا کی ذات کی طرف اشارہ ہے جبکہ بے دروبست جیسی ترکیب خدا کی لافانی ذات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

تخلیق انسان کا مقصد:

انسان کی تخلیق کرنے میں خدا کا کیا مقصد تھا؟ اور وہ مقصد یہ تھا کہ خدا زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا تھا جو اس کی بندگی کے ساتھ درد دل بھی رکھے۔ سعید کے مطابق قرآن مجید میں تخلیق انسان کا مقصد خدا کو اپنی بندگی مقصود تھا: ''قرآن پاک نے تخلیق بنی نوع انسان کا مقصد بھی صرف باری تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر اور اس کی عبادت بتایا ہے۔''[۴۶] عظمت انساں اس حوالے سے بھی عیاں ہے جب آدم نے نافرمانی کا گناہ کر لیا تو پھر بھی خدا نے اسے معاف کر دیا۔ خدا نے زمین پر انسان کو بااختیار بنایا ہے۔ اسے اپنے پیغمبروں کے ذریعے نیکی اور حق کا پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اپنی بندگی کے علاوہ اسے زندگی میں ایسے کام سونپتا ہے جس سے خدا کا نام ہی سربلند ہوتا نظر آتا ہے۔ شاعر خدا کی زبانی تخلیق کائنات کا مقصد اس طرح بیان کرتا ہے:

پھر کسی نے کہا:

میں بناتا ہوں آدم کا پتلا
اسے سونپتا ہوں زمینوں، زمانوں، جہانوں کے کچھ کام[۴۷]

آدم کا جنت سے زمین پر قیام:

حضرت آدم کی پیدائش کے بعد جب ان کو جنت میں داخل کیا گیا تو پھر اس سے خدا کی نافرمانی کا گناہ سر زد ہو گیا اس نے اس کھیت میں سے گندم کو کھالیا۔ شیطان نے اسے اور اس کی پسلی سے نکلی ہوئی حوا کو بہکا لیا لیکن خدا نے آدم کو معاف کر دیا اور اسے جنت سے نکال کر زمین اور آسمان کے ایک بڑے رقبے میں پھینک دیا جہاں اس نے ایک الگ دنیا بسائی۔ اس کو بے پناہ تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا زمانہ آدم کے جنت سے نکالے جانے اور پھر زمین میں بھیجے جانے کے متعلق ہے۔ جب خدا نے نافرمانی کی پاداش میں آدم سے اپنی نورانی لباس چھین لیا تو وہ شرم کے مارے پتوں سے اپنا بدن ڈھانپتا تھا۔ شعری اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

پھر اچانک محبت کی خوشبو میں بھیگی ہوئی زندگی
شبنم قرب سے تر بتر ہو گئی
روشنی کی قبا جسم پر مختصر ہو گئی
میں ندامت میں بھیگا ہوا
صرف پتوں سے اپنا بدن ڈھانپتا تھا
ترا سامنا کیسے کر پاتا میں[۴۸]

جب آدم زمین پر آیا تو وہ اکیلا تھا اور اس کا دکھ سننے والا کوئی بھی نہیں تھا تو خدا کے حکم سے ہی اس نے سفر شروع کیا اور خانہ کعبہ کی جگہ پر مکین ہوا اور اپنی دنیا بسائی۔ شاعر نے نظم ''تمثیل''میں کمال کی منظر کشی اور استعاراتی انداز میں زبان و بیان کو دلکش بنایا ہے۔ خدا نے کیسے سورج کو تخلیق کیا۔ شاندار لفاظی ملاحظہ فرمائیں:

مکاں۔۔۔۔لامکاں سے بنا کر
بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک گولا
خلا کو تھما کر
ہوائیں چلا کر سمندر بنا کر[۴۹]

تاریخی واقعات کا تذکرہ:

شاعر نے مختلف زمانوں کے حوالے سے انسانی ارتقا میں شامل مختلف تاریخی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جن سے از سر نو آدم کی زندگی کا سفر شروع ہوا تھا۔ زمین پر آکر بھی شاعر کے بقول حضرت انسان بے چین تھا اور خدا کو دوبارہ ملنے کا خواہشمند تھا۔ جب حضرت نوح کو اس کی قوم نے تنگ کیا اور اللہ کا پیغام نہ مانا تو اللہ نے اس قوم کو الٹ دیا اور حضرت نوح اپنی کشتی کو صحیح سلامت ایک اجنبی دنیا میں لے گئے اور یوں زندگی کا آغاز پھر دوبارہ سے ہوا۔

کہ شاخِ محبت سے اس نے اڑایا تھا مجھ کو
زمیں پر بچھی خاک پر لا بٹھایا تھا مجھ کو
بھڑکتی ہوئی آگ نے بھی ڈرایا تھا مجھ کو
مگر پانیوں نے بالآخر بچایا تھا مجھ کو(۵۰)

تیسرے زمانے میں شاعر دو اہم تاریخی واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ جن میں ایک واقعہ حضرت ابراہیم کا خانہ کعبہ کی تعمیر کا ہے اور یہ تعمیر کس لیے عمل میں آئی۔ اس کا جواب شاعر کے نزدیک انسان کی اپنے خدا سے محبت ہے۔ بقول شاعر:

پر ترے واسطے میں نے
کعبے کی بنیاد رکھی
ہر اک اینٹ کے درمیاں میں تری یاد رکھی(۵۱)

خدا کی طرف سے ملنی والی اتنی نوازشوں کے باوجود کچھ مسائل بھی انسانوں کو ہر زمانے میں پیش آتے رہے ہیں۔ شاعر خدا سے انہی سوالوں کے جوابات جاننے کا منتظر ہے۔ انسان خدا کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں نظر آتا ہے لیکن اس کا سرا بالکل نہیں ملتا۔ کبھی وہ خدا کو زمانے میں تلاش کرتا ہے تو کبھی کسی اور روپ میں۔ زیر نظر نظم میں بھی کردار واحد متکلم خدا کو اس طرح تلاش کرتا نظر آتا ہے:

کہیں آسماں میں
ستاروں کا میلہ لگا تھا
مگر مجھ کو تو

اپنا سایہ اکیلا لگا تھا[۵۲]

اسی زمانے میں دوسرا تاریخی واقعہ حضرت موسیٰ کا بیان ہوا ہے جب خدا کو دیکھنے کی چاہت میں پہاڑ جل گیا تھا اور موسیٰ کلیم اللہ خدا کی جھلک کی تاب بھی نہ لا سکے۔ انسان اس وقت سے ہی اس بھید کو نہ پا سکا۔

مری عمر تو
طور سیناپہ جلتی ہوئی
آگ کا راز معلوم کرتے ہوئے ڈھل گئی تھی[۵۳]

نظم میں واقعہ کربلا اور بنی اسرائیل کا تاریخی حوالہ بھی ملتا ہے۔

شعور کی رو کی تکنیک:

تیسرے اور چوتھے زمانے میں مصنف نے شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ یوں تو یہ ساری نظم ہی شعور کی رو کی تکنیک پر مشتمل ہے۔ شاعر نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے بے ہنگم خیالات کو اسی انداز میں صفحہ قرطاس میں اتارا ہے۔ شعور کی رو کی تکنیک بیسویں صدی میں اردو زبان میں وارد ہونے والی تکنیک ہے جسے بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے اندر برتا ہے۔ اب یہ تکنیک آزاد نظموں میں بھی استعمال ہونے لگی ہے کیوں کہ آزاد نظم میں بحر، قافیہ اور ردیف جیسی پابندیوں سے آزادی کے بعد اس کا استعمال آسان ہوتا ہے۔ شہزاد نئیر اس نظم کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ "یہ نظم اہم اضافہ ہے۔"[۵۴] اعجاز خاور کی زیر نظر نظم میں اس تکنیک کا ستعمال بہت زیادہ ہے۔ شاعر بات کو گھما پھرا کر کہیں سے کہیں لے جاتا ہے لیکن شاعری اسی چیز کا نام ہے کہ بات کی سمجھ کافی غور و فکر کے بعد آنی چاہیے۔ شاعر کے بے ہنگم خیالات، سوالات مختلف زمانوں کے ارتقا کے ساتھ جھلکتے نظر آتے ہیں۔

نظم کا واحد متکلم جو کہ پوری انسانیت کا سمبل ہے اپنے ماضی سے آگاہ اپنے حال سے ناآسودہ ایک جھلملاتی ہوئی روشن چلمن کے عقب کے منظر نامے کو دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ متکلم فردا کی خوشبو کی وادیوں کی طرف لگاتار بڑھتے رہنے کا اعادہ ہے۔ امید فردا ایک نشے کی کیفیت کی طرح ہے جو واحد متکلم کو نیم بے ہوشی یا نیند کی سی حالت میں نجانے کہاں سے کہاں لیے جا رہا ہے۔ اس سفر میں وہ البتہ قدم بہ قدم چلتا ہی جا رہا ہے۔ نظم میں ماضی، حال اور مستقبل کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا قاری کو سٹریم آف کانشیس کی یاد دلاتا ہے۔

زمانے!
سیاہی کے چنگل سے روشن زمینوں کی جانب
مجھے تو بلاتا ہے۔۔۔
فردا کی خوشبو پہن کر
مجھے نیند سی آرہی ہے
یہ ہجرت کی خواہش
(نہ جانے) کہاں کو لیے جارہی ہے(۵۵)

مذہبی تعلیمات کا تذکرہ:

انسان کو خدا نے ہر دور میں توحید کا پیغام بھجوایا۔ مختلف صحائف اور خدا کی کتابوں انجیل، تورات کے ذریعے اس کے پیغام بنی نوع انسان تک آتے رہے۔ شاعر نے زیر نظر نظم میں مختلف مذاہب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ وہ مختلف ادوار میں مذہب کے حوالے سے تقابل کرتا بھی نظر آتا ہے۔ شاعر ایک مخمصے میں مبتلا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ایک زمانے تک انسان تیرا پیغام مانتے رہے لیکن تو انھیں کسی روپ میں نہیں ملا۔ شاعر دراصل خدا کو کسی روپ میں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہے کہ وہ وحدت الوجود کا قائل ہے لیکن پھر بھی اسے خدا کی تلاش ہے۔ شاعر کے مطابق مختلف ادوار میں لوگوں نے تیرے صحائف میں موجود تیری کہانیوں کو مانا پرانے لوگوں کی طرح اب مجھے بھی ایک معبود کو ماننے کا حکم ہے۔ خدا کی تلاش میں بعض اوقات وہ بھٹک جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ خدا کی ذات پر قائم نظر آتا ہے:

پرانے زمانے کے لوگوں کو بھی
ایک معبود کے ذکر کا حکم تھا
اور مجھے بھی(۵۶)

جب دنیا دوبارہ خدا کے پیغام کو چھوڑ گئی تو آخری پیغام غار حرا میں نازل ہوا جس کی ابتداء اقراء سے ہوئی۔ اب انسان پر پانچ وقت کی نماز فرض ہو گئی تھی۔ انسان دعائیں مانگتا تھا اور ہر چیز اسی سے مانگنے کا حکم تھا لیکن انسان کی دعائیں کیوں خالی ہاتھ رہ جاتی ہیں۔ ہر زمانے میں ہی انسانیت کو خدا کے ہوتے ہوئے مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مصائب کبھی قحط کی صورت آئے اور کبھی جنگوں کی صورت۔ شاعر نے اس زمانے

میں اپنی رو میں مختلف مواقع پر دعاؤں کے اکثر خالی لوٹ جانے کا ذکر کیا ہے لیکن اکثر دعاؤں کی قبولیت کا ایک وقت ہوتا ہے اور جب وہ وقت آ پہنچتا ہے تو دعائیں ضرور قبول ہو جاتی ہیں۔ خاور اعجاز خدا سے شکوہ کرتے ہوئے اور ہر دور میں انسانیت کی بات کرتے ہوئے پر امید بھی ہے۔ شاعر نے اس زمانے کا اختتام امید بھرے پیغام کے ساتھ خدا کی ذات کو حق بر حق مانتے ہوئے کیا ہے:

کوئی موجود ہے آسمانوں سے آگے
جہانوں سے آگے
جہاں تیرے وعدے نے ہلچل مچائی ہوئی ہے(۵۷)

چھٹے زمانے کا آغاز شاعر نے قیامت سے کیا ہے۔ شاعر کے نزدیک سب زمانے ختم ہونے والے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور کے بعد مزید کوئی اب دور نہیں آئے گا۔ جنت سے نکلتے وقت جو مقصد حضرت انسان نے دل میں رکھا تھا وہ اپنے رب سے ملاقات کا تھا۔ خاور اعجاز کے مطابق اب دنیا ختم ہونے والی ہے اور یہ وعدہ پورا ہونے کے قریب ہے۔ انسان کے اپنے رب پر پختہ ہونے کا یقین ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

دھواں تھا کہ بس پھیلتا جا رہا تھا
میری حاضری کا ستارہ قریب آ رہا تھا(۵۸)

خاور اعجاز چھٹے زمانے کے بارے میں کہتے ہیں کہ

"چھٹا زمانہ ساعت دید کے آنے کا منتظر ہے۔ جب نوع انسانی کی غیبی صدا کی پکار پر میدان حشر کی نیلی چھت پر جلتے چراغ آرزو کے نیچے جمع ہو گی اور سب کی پوٹلیوں میں بندھا ہوا رخت سفر کھولا جائے گا۔"(۵۸)

طاغوتی طاقتیں:

چوتھے زمانے میں خدا اور انسان کی گفتگو بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ادوار اور موجودہ زمانے میں انسانوں پر ہونے والے ظلم و جبر اور طاغوتی طاقتوں پر نکتہ اٹھایا ہے۔ شاعر اپنے شعور میں آنے والے بے ربط خیالوں کو یوں ہی بے ترتیبی سے بیان کرتا جاتا ہے۔ اس زمانے میں مختلف ادور میں بنی نوع انسان کی بے بسی اور انسانی ترقی اور وسائل کی کمی کی وجہ سے انسان کی مشکلات کو بیان کیا گیا ہے۔ شاعر نے اس زمانے کا آغاز ساحل پر بیٹھ کر اپنے خیالات سے کیا ہے پھر یہ خیالات کی روبڑھ کر عظمت انسانی اور خدا

،انسان کے تعلقات جیسے فلسفیانہ موضوعات پر جا پہنچتی ہے۔ بقول روف ساحر "تمثیل بہت ہی عمدہ نظم ہے۔"(۵۹)

دنیا کا ہر انسان زمانے کی مشکلات کا شکار ہے۔ وہ ان سے نکلنا چاہتا ہے لیکن نکل نہیں پاتا۔ دعائیں کرتا ہے لیکن قبول نہیں ہوتیں۔ خواہشوں نے اسے گھیرا ہوا ہے اس کو صحیح نکلنے کا رستہ نہیں سوجھتا۔ شاعر کا مطمع نظر یہی ہے کہ خدا یہ پردہ ہٹاتا کیوں نہیں؟ اور انسان کو درست سمت کیوں نہیں دکھاتا؟ پانچویں زمانے میں دوسرا مضمون اس دنیا کے جبر و استبداد کے خلاف شاعر کا اظہار خیال ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا نے ترقی تو کر لی ہے لیکن اس سائنسی ترقی نے مادی فوائد کو عام کر دیا ہے۔ انسان اس کے سوا کچھ سوچتا ہے نہیں۔ خاور اعجاز کہتے ہیں کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی چلی جا رہی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کائنات انھیں چپ چاپ دیکھ رہی ہے۔

ترے ساحلوں پر سے
میں نے جو موتی چنے تھے
انھیں دل کے دریا میں بیٹھے
مگر مچھ نے نگلا ہوا ہے
مجھے مچھلیاں گرچہ میرے سنہری دنوں کی
لیکن کہانی کے آخر میں
ساری خزانوں بھری کشتیاں
ڈوب جاتی ہیں(۶۰)

تصور خدا:

انسان روز ازل سے ہی اپنے بنانے والے اور ایک طاقت جو یہ سارا نظام تھامے ہوئے ہے کا متلاشی نظر آتا ہے۔ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے طور پر خدا کا تصور قائم کر رکھا ہے۔ ہندو دیوی دیوتاؤں کو خدا کے روپ میں دیکھتا ہے۔ دیگر آسمانی مذاہب خدا پر یقین تو رکھتے ہیں لیکن تھوڑا یا بہت زیادہ۔ بیسویں صدی کی یورپی عیسائیوں نے خدا کو گرجا گھروں تک محدود کر دیا تو کیمونسٹ نے خدا کا انکار کر دیا۔ پھر بھی انسان غیر مطمئن ہے کیوں کہ وہ اس ہستی کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کی پریشانی بڑھتی ہے۔ شاعر بھی اس نظم

میں اسی مخمصے کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ خدا کی ذات سے کبھی مایوس ہو جاتا ہے تو کبھی پر امید۔ خدا کیا ہے؟ کہاں ہے؟ شریعت محمدی میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ سورہ اخلاص کا ترجمہ خدا کی پوری تعریف و توضیح ہے:

"تم فرماؤ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا باپ ہے اور نہ کوئی اس کا ہم سر ہے"(۶۱)

خدا کے تصور سے واقفیت اور اس کی پہچان کے لیے کئی شعراء نے اپنے مضامین شاعری میں بیان کیے ہیں۔ اس اڑان کے ذریعے شاعر بھی خدا کی ذات تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاعر کو خدا کے وصل کی بہت خواہش ہے۔ وہ انسانیت اور خدا کی بنائی ہوئی ہر آبی اور خاکی مخلوق میں خدا کی قدرت کو دیکھتا ہے۔

اجالے کی امید کم تھی
مگر میں ترے وصل کے خواب بنتا رہا
ہجر کانٹوں سے پھول چنتا رہا(۶۲)

انسان ہزاروں سال سے اس دنیا میں رہ رہا ہے۔ اس کی حیرانی کم نہیں ہوئی۔ وہ مخلوق خدا اور قدرت کائنات کے رنگ بدلنے پر حیران و پریشاں ہے۔ انسان کو کچھ معلوم نہیں کہ یہ بہتا ہوا دریا کدھر جا رہا ہے اور کہاں پر ختم ہو گا۔ ماضی کو کسی بھی گوشے کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ شاعر بھی اس سلسلے میں حیران نظر آتا ہے۔ خاور اعجاز انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ "یہ نظم میرے اور زمانے (خدا) کے درمیان مکالمہ ہے۔"(۶۳) شاعر کے مطابق انسان خدا سے الگ نہیں ہے۔ اس کی ذات خدا کی ذات سے منسوب ہے۔ بلکہ وہ ہر وقت اس کے پاس موجود ہے۔ شاعر خود ہی سوال تخلیق کرتا ہے اور خدا کے وجود کے متعلق سوالات کرتا ہے۔ پھر خود ہی خدا کے وجود کے ہونے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ خدا کہاں ہے؟ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ ہر چیز اس کی قدرت میں ہے۔ شعری اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

تو پھر کون ہے جو
زمینوں کے خوابوں میں
نیلے سمندر میں بہتی ہوئی دودھیا جھاگ میں
سبز جنگل میں بھڑکی ہوئی آگ میں(۶۳)

تصور شکوہ:

شاعر کے اندر ایک ڈر سا ہے وہ خدا کو اپنے قریب سمجھ کر بھی ڈر میں مبتلا ہے کہ کہیں وہ میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں کدھر جاؤں گا۔ یہ سارا زمانہ خدا اور انسان کے اسی شکوے کے گرد گھومتا ہے کہ خدا پاس ہو کر بھی پوری طرح ساتھ کیوں نہیں دیتا۔ خدا کی ذات انسان کے قریب ضرور ہے لیکن جس کو کامل یقین ہو جائے تو وہ یہی بات سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ خدا نے میرے لیے کوئی بھلا ہی سوچا ہو گا۔ مرید عباس خاور کہتے ہیں کہ "نظم میں شکوے کے اسلوب کی جھلک چنگاری سے الاؤ تک پہنچتی ہے۔"(۶۴) واحد متکلم اللہ تعالی سے شکوہ کرتا ہے کہ تو مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ میرا یہ سفر کب ختم ہو گا؟ آخر کب تک مجھے یہ سفر جاری رکھنا ہو گا۔ اس سفر کی باگ زمانے کے ہاتھ میں ہے۔ میں زمانے کی عطا کردہ زندگی گزار رہا ہوں لیکن پھر بھی تو نے مجھے اپنی جھلک کیوں نہیں دکھائی۔

تیرے ماتھے پہ رنجش کا بل تو نہیں ہے
مجھے صرف اتنا بتا دے
کہ میں ان خلاؤں میں
اندھی گھپاؤں میں
کب تک چلوں گا(۶۵)

انسانی ترقی:

انسان نے اس دنیا میں بتدریج ترقی کی ہے۔ پہلے پتھر کا زمانہ تھا انسان غاروں میں رہتا تھا۔ پھر دھات کا زمانہ آ گیا۔ مختلف دھاتوں کے اوزار استعمال ہونے لگے۔ اس کے بعد آج نت نئی ایجادوں پر مشتمل سائنس کا زمانہ ہے لیکن اتنی ترقی کے باوجود انسان کہاں ہے۔ شاعر کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔ کل بھی اس کو کوئی راستہ نہیں ملتا تھا اور آج بھی وہ حیران و مضطرب کھڑا ہے۔

ریت بھی ہے وہی
اور صحرا وہی
کوئی چشمہ مگر ابلتا نہیں
غار سے کوئی رستہ نکلتا نہیں(۶۶)

پانچواں زمانہ انسانی ترقی کا زمانہ ہے جب انسان چاند پر جا پہنچا لیکن خدا تک ابھی نہیں پہنچ پایا اور نہ ہی کائنات کے اصل راز وامور سے آگاہ ہو سکا ہے۔ اس زمانے میں شاندار امیجری سے کام لیا گیا ہے۔ سیتہ پال آنند کہتے ہیں کہ "نظم کے اس حصے کی امیجری اسے زمانہ حال میں پیوست کرتی ہے۔"(۶۷) شاعر کو امید بھی ہے کہ یہ سیاہی ایک دن چھٹ کر اسے کائنات کے راز ومور سے ضرور آگاہی کروائے گی۔ اس نظم کا انسان مسلمان ہے اس لیے وہ اپنے ارد گرد کے گنبدوں کی تجلی سے اپنا دل تو ضرور بہلا رہا ہے لیکن حق سے روشناس نہیں ہو رہا۔

زمانے!
مجھے یہ خبر ہے
کہ یہ راستہ خوابگاہوں سے ہو کر
نئے موسموں اور نئی سرزمینوں میں کھلتا ہے(۶۸)

تصور زمان و مکاں:

زماں اور مکاں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ بنی نوع انسان پر جو واقعات بیتے ہیں وہ ایک جگہ اور ایک زمانے کے مطابق روپذیر ہوتے ہیں۔ زیر مطالعہ نظم چوں کہ گہری فلسفیانہ موضوع کی حامل ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے خیالات کا اظہار سات زمانوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔ ان زمانوں میں جو مختلف واقعات رونما ہو رہے تھے، انسان کی ترقی اور خدا کے بارے میں اس کی سوچ کیا تھی؟ آج انسان اتنی ترقی کر کے سوچ کے کس دھانے پر کھڑا ہے؟ ان سوالوں کو شاعر نے اپنی طرف سے پیش کر کے بعد ازاں ان کا جواب سوچنے کی بھی کوشش کی ہے۔ افتخار بخاری نظم کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ

"Deep thought provoking and beautiful"(۶۹)

پہلے تین زمانے ابتدائی اہمیت کے حامل ہیں جن میں پیش کیے خیالات گزشتہ نکات کے تحت کیے جا چکے ہی ں۔ جیسے جیسے ترقی ہوئی انسان پستی کا شکار ہو رہا ہے۔ سابقہ قوموں کو ان کے پیغمبروں نے بچا لیا۔ آج کا زمانہ بھی اپنی معاشرتی اور اخلاقی پستی کے باوصف کسی کلیم کا منتظر ہے۔ آخری زمانہ اب قادر مطلق سے ملنے کا زمانہ ہے شاعر اپنی کم ہمتی اور زمانے کے مصائب پر مسلسل نوحہ خواں نظر آتا ہے۔ شاعر کے نزدیک اب یہ زمانہ

ختم ہونے کے قریب ہے۔اب ایک آخری مرحلہ قریب آنے کو ہے۔شاعر جس وقت کا انتظار کرہاہے وہ شاید نہ آئے۔

مرے آخری رقص کا وقت ہے
وحشت شوق صندل کی مانند جلنے لگی ہے
رگ وپے میں
ان دیکھی دنیا کی خواہش مچلنے لگی ہے(۷۰)

رجائیت:

شاعر اتنی ناامیدی کے باوجود بھی ناامید نہیں ہے۔وہ خدا سے دعا کرتا نظر آتا ہے۔اتنے زیادہ شکوک کے باوجود شاعر اپنے رب سے لاتعلق نہیں ہے یہی اس کا اپنے رب پر پختگی کا یقین ہے۔ انسان دنیا میں یہی مقصد لے کر آیا تھا کہ آخر ایک دن اس نے اپنے رب کے حضور جانا ہے اور یہ ''میں'' اور ''تو'' کی دوری ''ہم'' میں تبدیل ہوگی۔اس زمانے بھی انسان محرویوں کا ہر طرف شکار نظر آتا ہے۔شاعر اتنی زیادہ الجھن کے باوجود بھی پر امید ہے اور زمانے سے توقع لگائے بیٹھا ہے۔

مرے دل کے آنگن میں آ
خواب چن
آنکھ کو نیلگوں بیکرانی سے آباد کر
دل کے صحرا میں پانی کا چشمہ اگا
مجھ کو سیراب کر، خود بھی سیراب ہو
میں ترا خواب ہوں، تو مرا خواب ہو(۷۱)

اس نظم میں چوتھا، پانچوں اور چھٹا زمانہ دراصل ایک ہی زمانے کی لڑیاں ہیں اور وہ جدید زمانہ ہے۔شاعر نے اپنے ذہن کے بکھرے ہوئے خیالات کو جو کہ یقیناً معاشرتی بے حسی، خدا کے قوانین سے انحراف اور جدید دنیا کے انسان اور خدا کے درمیان تعلق پر مبنی ہے، کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔شاعر کا تصور خدا کے بارے میں ناپختگی کا شکار ہے۔وہ خدا پر تنقید بھی کرتا ہے لیکن اس کا نظریہ پھر بھی خدا پر قائم ہے۔بعد ازاں وہ خدا سے مناجات کرتا بھی نظر آتا ہے۔خاور اعجاز انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ

"آخری دو زمانوں کا نقطہ اتصال انسان اور خدا کے درمیان موجود من و تو کے رجحانات کا پردہ چاک کر دے گا اور قرنوں سے چلتی ہوئی امید و بہم کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچے گی"(۷۲)

نابودیت:

نابودیت ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جو ایک ایسی جہت کے لئے استعمال کی جاتی ہے جس میں سے گزر کر اشیا اپنا وجود کھو دیتی ہیں یا وجود میں آجاتی ہیں۔ جیسا کہ خدا نے کچھ بھی نہیں میں سے کائنات کو وجود بخشا۔ عیسائیوں میں تباہی (جسے معدومیت بھی کہا جاتا ہے) کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ جو لوگ شریر ہیں وہ ہلاک ہو جائیں گے یا ان کا وجود ختم ہو جائے گا۔ حتمی فیصلے کے بعد تمام بے نیاز انسان تمام گرے ہوئے فرشتے اور شیطان خود مکمل طور پر تباہ ہو جائیں گے۔ ان کا شعور جہنم میں لازوال عذاب کا شکار ہونے کی بجائے بجھا دیا جائے گا۔

تباہی کا براہ راست تعلق مشروط لافانیت کے نظریے سے ہے۔ یہ خیال ہے کہ انسانی روح اس وقت تک لازوال نہیں ہوتی جب تک اسے ابدی زندگی نہ دی جائے۔ تباہی کا دعوی ہے کہ خدا بالآخر شریروں کو تباہ کر دے گا اور صرف صادقوں کو لافانی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دے گا۔ کچھ تباہی پھیلانے والے مثلاً ساتویں دن کے ایڈونٹسٹ کا خیال ہے کہ خدا کی محبت اسکرپٹوریلی ہے جسے سب سے زیادہ استعمال کرنے والی آگ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ گناہ گار مخلوق خدا کی موجودگی میں موجود نہیں ہو سکتی۔ اس طرح جو لوگ اپنے گناہوں سے توبہ نہیں کرتے وہ خدا کے مقدس کردار کے ساتھ گناہ کی فطری عدم مطابقت کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتے ہیں۔ ساتویں دن کے ایڈونٹسٹوں کا کہنا ہے کہ ابدی جہنم میں رہنا مشرکانہ اصل کا ایک جھوٹا نظریہ ہے کیونکہ شریر آگ میں ہلاک ہو جائیں گے۔ نابودیت کا ذکر خاور اعجاز کی اس نظم میں بھی ملتا ہے شاعر نے نظم کے آغاز میں ہی لاکے صندوق سے کن کا پرچم کھلا اور پھر آخر میں انسان کا اس زمانے یا خدا کی طرف لوٹ جانے کی بات کی ہے۔ یہ نابودیت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

سفر ختم ہوتا ہے
منزل لگاہوں کے اندازے تک آگئی
تری نیلی دستک

مرے دل کے دروازے تک آ گئی ہے!
مرے آخری رقص کا وقت ہے۔۔۔
ان دیکھی دنیا کی خواہش مچلنے لگی ہے
چمکتی ہے تلوار سی کوئی قرب گلو میں
ہے گونجی ہوئی اک ندا چار سو میں
تری مہربانی کی۔۔
مرے ریگزار تمنا میں
کچھ پھول رکھے ہیں
جو میں تری نذر کو لا رہا ہوں
زمانے!
پکارا ہے تو نے
تو میں آ رہا ہوں(۷۳)

نوحہ گری:

خاور اعجاز تمثیل میں کم ہمتی ، زمانے کے مصائب اور مشکلات پر نوحہ کرتا ہے۔ وہ واحد متکلم کے ذریعے نوحہ کرواتے ہیں کہ یہ مسلسل چلتے رہنے والا سفر کب ختم ہو گا؟ کئی برس گزر چکے ہیں آخر کب تک مجھے یوں ہی آگے بڑھتے رہنا ہو گا؟ نظم میں واحد متکلم خدا سے اپنی جنت کے کھونے کا نوحہ بھی کرتا ہے کہ مجھے مٹی کا جسم عطا کر کے پانی، آگ، مٹی اور ہوا کے مرتباں یعنی زمین پر کیوں بھیجا؟ یہ میری کھوئی ہوئی جنت کا نعم البدل نہیں ہے۔ اس دنیا میں میرے مسائل کا حل نہیں ہے اور نہ ہی اس دنیا میں میرے مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔

زمانے
یہ جو خاکداں خاک زادے کو تفویض کی ہے(۷۴)

شاعر نے خاکداں زمیں اور خاک زادے انسان کے لیے استعارہ استعمال کیا ہے۔بقول پرویز ساحر "یہ اعلی سلسلہ وار نظم ہے۔"(۷۵)

انسانی خواہشات کا تذکرہ:

نظم کے چھٹے زمانے میں انسانی خواہشات کا تذکرہ ہے۔اس میں جہاں چاہ ، ارمان ، حسرت ہے وہاں احتیاج، اقتضا کا ذکر شدت سے نظر آتا ہے۔واحد متکلم تشنہ ، بے صبر ہے وہ آنے والے زمانوں کا تمنائی ہے۔ شاعر نے زمانے کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ اس نظم میں زمانے کی عمدہ تجسیم ملتی ہے۔شاعر زمانے کو اپنی آنکھوں میں اتار لینا چاہتا ہے۔ نظم کا کردار واحد متکلم یعنی انسان زمانے کے صحرا میں اتر جانے کی خواہش رکھتا ہے تا کہ زمانے سے دوستی کی جاسکے اور اس کے ساتھ چلا جاسکے ورنہ یہ بہت برق رفتار ہے۔ خاور اعجاز انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ

> "چھٹا زمانہ آنے والے آخری زمانے کا پیش لفظ ہے اس آخری زمانے سے متصل چھٹے زمانے میں زمان آخر سے ہمکنار ہونے کی تمنا موجود ہے۔"(۷۶)

نظم میں انسان اللہ سے ملنے کی خواہش اور اس کو دیکھنے کا تمنائی بھی ہے۔ اس امید کے سہارے زندگی کے مصائب برداشت کرتا ہے اور خود کو زمانے میں سمونا چاہتا ہے۔

ابھی تو میں صبح ازل کے
قدم سے قدم کو ملائے ہوئے چل رہا ہوں۔۔
تجھے دیکھنے کی تمنا میں سوتا ہوں
اور تجھ کو پانے کی امید میں جاگتا ہوں(۷۷)

نظم میں کہیں انسان خدا سے مخاطب ہو کر اپنی خواہشات کا ذکر کرتا ہے کہ اس زمانے میں میں ابھی اس بات کا منتظر ہوں میرے لفظ جگنو بنیں، میرے ہونٹوں پر خوشبو رہے، میرے آنسو ستاروں کی مانند چمکیں اور میرے دل کے پرندے تیرے گیت گائیں یعنی بہت ساری خواہشات انسان رکھتا ہے اور ساتھ ہی اللہ تعالی سے کہتا ہے کہ اس خواہشات کے بھنور سے مجھے نکال دے۔

تصور غم:

عالم بالا سے انسان روتا ہوا اس دنیا میں وارد ہوا۔وہ دنیا میں اور کچھ لایا یا نہیں یہ تو معلوم نہیں مگر آدم کی آنکھ میں جدائی کا غم ضرور حزن بن کے ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے بیان کے بنا شاعری نامکمل ہے کیونکہ رنج

والم انسانی خو ہے۔ غم کی بدولت انسان زندگی کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے ہر انسان کو غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسان کی نسبت شاعر حضرات زندگی کے دکھ درد کا گہرا اثر لیتے ہیں۔ زندگی میں غم کو حقیقت قرار دیتے ہیں۔

اے زمانے!
غم زندگی کے الاؤ میں جلتے
تیرے ہجر صحراوں میں چلتے چلتے
میں اب خاک ہونے کو ہوں(۷۸)

تمثیل دراصل ایک سوالنامہ ہے اور اس نظم میں انہوں نے زمانے میں آنے والے لاتعداد خیالات کو جس طرح قلمبند کیا ہے وہ بے ربط ہوتے ہوئے بھی ربط رکھتے ہیں۔ اس نظم کے بارے میں خاور اعجاز کی اپنی رائے یہ ہے

> "یہ نظم ۲۰۰۳ تا ۲۰۰۶ کے رمضان کے مہینوں میں وارد ہوتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور دنوں میں اس کا نزول نہیں ہوا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظم قدرت کی عطا ہے اور مجھے یہ نظم بہت عزیز ہے۔(۷۹)

ان کا واحد متکلم والا انسان دراصل مسلمان ہے جو لفظ "کن" سے شروع ہونے والی اس کائنات کو پیغمبر کے قصوں سے بیان کرنا شروع کرتا ہے۔ خدا کی تلاش میں وہ ہر زمانہ میں داخل ہوتا ہے اور اپنے اور خدا کے درمیان کے تعلق کو دریافت کرنے کا خواہشمند ہے۔ آخر میں وہ رخت سفر باندھے ملتا ہے کیونکہ مایوسیوں کے بادل میں خدا کو وہ کہیں بھی تلاش نہیں کر پارہا اور اب اس کی آخری منزل موت ہے جس سے ہمکنار ہو کر وہ خدا سے مل پائے گا۔

بقول سرور جاوید:

> "نظم دراصل ایک مناسب طوالت کی طلب گار ہے اور ساتھ ہی ایک بڑی تخلیقی قوت کا مطالبہ کرتی ہے۔ نظم میں خیال کا تسلسل غیر محسوس طریقے سے رواں رہتا ہے یعنی نظم کا مرکزی خیال بین السطور نظم میں جاری رہتا ہے اور نظم کی پنچ لائن اس کو تکمیل اظہار تک پہنچاتی ہے۔"(۸۰)

یہ نظم ٹکڑوں میں ہے مگر خیال اتنا طاقتور، اظہار اتنا موثر ہے کہ ہر قاری خیال کے تسلسل کو محسوس کرتا ہے۔ یہ نظم متن میں اجماع واجتماع کے باوجود با تسلسل اور مضبوطی سے پست ہے۔ نظم کی خاص بات اس کی امیجری ہے۔ مصنف نے ہر دور کی عکاسی مختلف زمان ومکاں کے حوالے سے انتہائی دلکش انداز میں کی ہے۔ تمام موضوعات نہایت اہمیت کے حامل اور بحث طلب ہیں۔ یہ پوری نظم چونکہ سوالیہ نشان ہے۔ اپنے بے ربط سوالوں کے جواب تلاش کرنے کا کام شاعر نے قاری پر چھوڑا ہے۔

ج: نظم تراش کے موضوعات کا تجزیہ

مختار صدیقی " موہنجو داڑو کی رقاصہ "، ن م راشد "حسن کوزہ گر"، مجید امجد "نہ کوئی سلطنت غم"، اختر حسین جعفری "آئینہ خانہ"، سلیم احمد "مشرق"، ضیا جالندھری کی نظم "ہم"، جمیل الدین عالی "انسان" اور وزیر آغا کی نظم "آدھی صدی کے بعد" کے تسلسل میں اختر عثمان کی طویل نظم "تراش" ہمارے عہد کی ایک بہت پر ماجرا تخلیق ہے۔ طویل نظم کے بارے میں اختر عثمان کا کہنا ہے:

> "شاعری ریاضت کا نام ہے جتنی ریاضت ہو گی علم مختلف شعبہ جات زندگی میں اتنا ہی وسیع ہو گا۔ طویل نظم ایک آرٹ ہے میں نظم اس کو سمجھتا ہوں جس میں سطر تو کیا ایک لفظ بھی کاٹا نہ جا سکے۔"(۸۱)

تراش مشکل اور پیچیدہ نظم ہے جس میں ابہام رچا ہوا ہے۔ ہر قرات میں بعض معنی طلوع ہوتے نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم اپنے حصار سے باہر آنا چاہتی ہے۔ نظم میں تاریخ کے ازل سے حال تک کے سفر کے بیان کے علاوہ مستقبل کے امکانات کا بھی بھرپور تخلیقی وفور سے جائزہ لیا گیا ہے۔ نظم کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ درج ذیل موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

تخلیق کائنات:

اختر عثمان نظم تراش میں اسلامی نقطہ نظر کے تحت تخلیقی کائنات کو بیان کرتے ہیں یعنی کائنات دو لفظوں کن، فیکون سے تخلیق ہوئی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

> "(اور اس کے حکم صادر کرنے کی کیفیت یہ ہے کہ) جب وہ کسی امر کو انجام دینے کا ارادہ فرماتا ہے تو بے شک حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔"(۸۲)

اختر عثمان کائنات کی تخلیق کے عمل کی وضاحت کرتے ہوئے عظیم دھماکے کے نظریے کو شاعرانہ مزاج میں یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ امر جس نے اس ذرے کو دھماکے پر مجبور کیا اسے حرف کن قرار دیتے ہیں۔ خدا نے لفظ کن کہا تو فیکون ہو گیا۔ شاعر کے مطابق تخلیق اللہ کی چاہت کی بدولت ہوئی۔

نجانے وہ کون سی سمسائیں ہیں جو اک ساتھ پاپ پن گن اگن رہی ہیں۔۔۔
وہ کہہ رہی ہیں کہ ساری بپتائیں ساری آشائیں لطمہ لفظ کن رہی ہیں(۸۳)

تخلیق آدم:

اللہ تعالی نے انسان کو اس لیے تخلیق کیا کہ میں پہچانا جاسکوں۔ حضرت آدم کی تخلیق اور پھر ان کی پسلی سے حضرت حوا کی تخلیق کا مضمون شاعر نے خوبصورت استعارے میں بیان کیا ہے۔ انسان کو اس لیے عظیم بنایا گیا کہ اس کی تخلیق سے کائنات کی تکمیل ہوئی اور یہ کئی رازوں سے واقف ہے۔

تمھیں بنانے میں خود کو چھیلا
اور ایسا چھیلا کہ ایک نس بھی تراش وجراحی بدن میں کٹی نہیں(۸۴)

عظمت انسان:

جب کبھی بھی تخلیق کی بات کی جائے تو خالق سے ضرور جا ملتی ہے۔ اللہ ربّ العزت نے انسان کو اشرف المخلوقات، افضل الملائک یعنی تمام مخلوقات سے بالاتر بنایا ہے جو کہ عظمت انسانی کا ایک ایسا ثبوت ہے جسے جُھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اللہ ربّ العزت نے انسان کی تخلیق کو اپنی وحدانیت پر سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے جیسا کہ انسان کی پیچیدہ تخلیق ہی انسان کی فضیلت کو واضح کرتی ہے اور خود انسان کے اندر ہی اسکی فضیلت کے شواہد موجود ہیں۔ یہ نظم عظمت انسان کا اثبات کرتی ہے۔ اللہ ربّ العزت نے مشت خاکی کو کمال دیتے دیتے انسان بنادیا اور اسے ایسی قوائے انسانیہ عطا کی گئی جن سے وہ امور کلی دریافت کرنے کے قابل بن گیا۔

جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے۔

"بے شک ہم نے اولاد آدمؑ کو فضیلت دی اور ان کو خشکی اور سمندر کی سواریاں دیں اور ان کو طیب چیزوں سے رزق دیا اور ان کو ہم نے اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔"(۸۵)

نظم میں فرد کی آفاقیت کی شناخت کے ساتھ نوع انسان کے نمائندہ فرد کی ترجمانی اسی کی زبانی کی گئی ہے۔اس میں انسان کے مختلف روپ کا تذکرہ بھی ملتا ہے شاعر کہتا ہے کہ کہیں انسان خدا کا نائب ہے تو کہیں شیطان، حاکم و محکوم، نجم ساز، اچھے برے کام کرنے والا، ناممکن کو ممکن بنانے والا اور زمانے کے راز کھولنے والا ہے۔ تمام مقاصد انسان میں پوشیدہ ہیں۔

میں زمرد و کائنات میں سرفراز بھی ہوں
میں آدمیت کے واسطے اعتراز بھی ہوں۔۔۔
میں فرد مولا صفات، بندہ نواز بھی ہوں(۸۶)

معاشرتی عدم مساوات:

کسی بھی معاشرے کو امن، ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہاں مساوات قائم کی جائے یعنی تفرقہ ختم کیا جائے اور برابری کو فروغ دیا جائے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے اور قرآن و سنّت کی تعلیمات نے انسان کو مساوات کا درس دیا ہے۔ رسولِ پاک ؐ کا ارشاد ہے کہ کسی کالے کو گورے پر، امیر کو غریب پر، طاقتور کو کمزور پر اور عربی کو عجمی پر کوئی برتری حاصل نہیں بلکہ انسان کو برتری صِرف اور صِرف تقویٰ کی بنا پر حاصل ہے۔

ہے آدمی کی پہچان تو آدمیت سے　　زبان فارسی ہو اس کی یا لاطینی

اختر عثمان کے ہاں انسان کسی خطے کا بھی ہو کوئی زبان بھی بولتا ہو کسی بھی رنگ کا ہو تمام انسان آدم کی اولاد ہونے کے ناطے برابر ہیں۔

زماں و مکاں میں بس ایک آواز ہر ساعت میں گونجتی تھی
تم ایک ہو سب
سیہ سفید ایک ہیں
کسی کو کسی پہ کچھ برتری نہیں ہے(۸۷)

شاعر نے معاشرے میں مساوات کے نہ ہونے پر گریہ و افسوس کا اظہار کیا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کی ہے جس نے معاشرے میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔ شاعر نے عوام کا پیسہ چند سرمایہ داروں کے حوالے کرنے سے مختلف طبقات کی غربت اور بے بسی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا ہے کہ خزانہ خالی ہوتا جا رہا ہے

اور غریب مزدوری کرنے والی عوام روز بروز مزید پستی کی طرف دھکیلے جارہے ہیں۔ عوام کو برابری کی صَف سے نکال کر الگ الگ حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے جہاں سرمایہ دار لوٹ مار کر کے غریب لوگوں کو کُچلتے جارہے ہیں۔

بقول جواد ہمدانی:

"نظم کے کبھی طویل اور کبھی مختصر مصرعے اس سماجی ناہم آہنگی اور معاشرتی عدم مساوات کا بیان ہیں جو معلوم تاریخ سے نامعلوم زمانے تک ہیں وہ زہر آلود قہقے بھی جو برتری کی سر انڈھ سے باغ زیست کی باس کھارہے ہیں۔"(۸۸)

طبقاتی جدوجہد:

شاعر نے کارل مارکس کے نظریے کا ذکر کیا ہے۔ کارل مارکس کے مطابق روح سے مادہ زیادہ اہم ہے وہ اس بات کا قائل ہے کہ انسان کا فرض ہے وہ اپنے جسم کی بہتری کے لیے کوشش کرے۔ کسی بھی سماج میں کچھ لوگوں کے مقاصد اور کاوشیں دوسرے لوگوں کے مقاصد اور کاوشوں سے متصادم ہوتی ہیں اور یہ کہ سماجی زندگی تضادات سے بھری پڑی ہے۔ تاریخ سماجوں کے درمیان اور سماجوں کے اندر ایک جدوجہد کو ظاہر کرتی ہے۔ اختر عثمان کا کہنا ہے کہ "نظم بتاتی ہے کہ کیسے سات لوگ پورے خزانے پر قابض ہوئے۔ سات ارب لوگ ایڑھیاں گھسیٹ کر مر رہے ہیں اور مارے گئے۔ یہ ترقی پسند نظم ہے۔"(۸۹) مارکس نے کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھا تھا کہ "تاریخ میں جتنے بھی سماج گزرے ہیں انکی تاریخ طبقاتی جدوجہد سے عبارت ہے۔ آقا اور غُلام، جاگیر دار اور مزارع، سرمایہ دار اور محنت کش آسان الفاظ میں جابر اور محکوم مسلسل ایک دوسرے کے خلاف صَف آراء رہے ہیں اور ایک ایسی جنگ میں مستقل طور پر مصروف رہے ہیں جو کبھی پوشیدہ اور کبھی کھلے عام لڑی جاتی رہی لیکن نتیجہ ہر بار یا تو سماج کی مجموعی انقلابی تشکیل نو کی صورت میں بر آمد ہوا یا طبقات کی باہمی تباہی کی شکل میں۔

غلام و آقا کے خط میں تقسیم ہو کے الجھے ہوئے کھلونے
جو خیر و شر کے سیاہ و روشن کو اوپری دل سے مانتے ہیں
یہ آپ اپنی قبیل کے جبر ساز حلیوں سے پسنے والے۔۔
یہ ایسے تاریخ زاد ہیں جو نظام تفریق میں سر فرش چیختے ہیں(۹۰)

لاوقت سے وقت:

نظم کی ابتدا میں دولویں، چراغ آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ دولورز ایک سنجوگتا اور دوسرا فنکار اس گفتگو کو سن رہے ہیں۔ نظم میں شاعر چونکہ تصوّر اور سوچ کے حصار باندھتا ہے اور جب تک اسکے تصوّراتی مجسمے کو ایک خاص اور منفرد شکل نہیں مل جاتی وہ لاوقت میں بھٹکتا رہتا ہے مگر جیسے ہی وہ اپنے جذبات اور خیالات کو تراشتے ہوئے ایک مجسمے کی شکل دے دیتا ہے تو اس محنت کا صلہ شاعر کو لاوقت سے نکال کر وقت میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اس طرح شاعر لاوقت میں ٹہلتا ہوا وقت سے آملتا ہے اور نظم کے آخر میں مجرد کردار سنجوگتا مجسم یعنی سماجی فرد بن جاتا ہے اور فرقہ واریت کی مخالفت کرتا ہے۔

سکوت فرداودی کے سونے سمے میں بھولی لویں بیانات بن رہی ہیں۔۔۔۔
میں اپنی سنجوگتا کے ہمراہ ساعت سبز میں نئی نظم بن رہا ہوں[۹۱]

ماحولیات کی تباہی:

شعراء ہمیشہ سے اپنے الفاظ کے ذریعے لوگوں میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے آئے ہیں اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال اپنی مثال آپ ہیں جن کی شاعری نے ایسا انقلاب برپا کیا کہ مسلمانوں کو دنیا میں جنت کا نظارا پیارے ملک پاکستان کی صورت میں ملا۔ اس نظم میں بھی شاعر نے اپنے اِرد گرد نظر دوڑاتے ہوئے ماحولیات کا جائزہ لیا ہے اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

شجر پہ انکی جگہ مچانوں کی بربریّت ہبوطِ آدم کا زرد قصّہ سنا رہی تھی
کمین گاہوں میں خفتہ موذی، خلیفتہ الارض کے ستم سے عجیب
لرزے میں مبتلا تھے
طیور۔۔۔ منکار زیر پر، زمزموں سے خالی اُجاڑ تٹ کو بچشمِ دُزدیدہ
دیکھتے تھے[۹۲]

شاعر نے دورِ جدید پر گہری نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ آج جب وہ جہاں دیکھتا ہے اُسے انسان کی بنائی ہوئی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی نے درختوں اور پودوں کی جگہ مکان اور فیکٹریاں کھڑی کر دی ہیں۔ قدرت کے وہ نظارے جو پہلے کبھی راہ چلتے آنکھ کو بھاتے تھے اب دکھائی نہیں دیتے بلکہ انسان نے پرندوں کے آشیانے بنانے کی بھی جگہ نہ چھوڑی ہے وہ جہاں تک ممکن ہے آگے بڑھنا چاہتا ہے ماحول کی اُسے

کوئی پرواہ نہیں اس لیے ماحول کو اُس نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ دُکھ بھرے الفاظ میں قدرت کے ان تمام نظاروں کو یاد کر کے شاعر کہتا ہے کہ اللہ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا مگر انسان نے اُسی دنیا میں تباہی مچادی ہے۔

بقول خورشید رضوی:

> "زمین پر آدم کی پہلی چاپ ہیبت آور ہے اور فرشتوں کے سوئے ظن کی تعبیر بھی چناچہ اس کے سفر کا آغاز ہی ہے جو خون ریزی، فساد کیفیت لیے ہوتا ہے مگر پھر پھیلی ہوئی مسافتوں کے نشیب و فراز میں زندگی خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتے ہوئے ساعت صفر سے ساعت سبز تک کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔"(۹۳)

پتھر سے جدید زمانے کا احاطہ:

یہ بھی ایک فطری عمل ہے کہ انسان کو بیتا کل یعنی ماضی اپنے حال سے بہتر دکھائی دیتا ہے اور وہ اُس ماضی کو واپس حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اِبنِ آدم کے اس رویّے کی ایک وجہ اُسکا ناشُکرا ہونا بھی ہے مگر "تراش" میں ماضی قریب کی نہیں بلکہ پتھر کے دور کی بات چھیڑی گئی ہے اور اسکا موازنہ آج کے دور سے کیا گیا ہے۔ قتل و غارت گری روز ازل سے انسان کا شیوہ رہی ہے بھر چاہے وہ قتل آدم کا ہو یا قدرت کے حسین نظاروں کا ان کا مجرم انسان ہی ہے۔ شاعر نے اُکتاہٹ بھرے الفاظ میں کچھ یوں بیان کیا ہے کہ

آدمی کھیل کھیل ہی میں مظاہر خوش کلام نابود کر رہا ہے
وہ پھر بھی چُپ ہے
اور ارض قابیل زاد وحشت سے بھر چکی ہے(۹۴)

شاعر نے بظاہر تو یہاں انسان کے ہاتھوں قُدرتی ماحولیات کی تباہی کو ظاہر کرنا چاہا ہے اور کہا ہے کہ آدمی اپنی ناسمجھی اور لاپرواہی میں قدرت کے حسین نظارے برباد کر رہا ہے لیکن قدرت خاموش ہے لیکن ساتھ ہی اگلے مصرعے میں آدمؑ کے بیٹے قابیل کا ذکر کرتے ہوئے اسکے وحشی پن کو یاد کیا گیا ہے جب اُس نے اپنے ہی بھائی کا خون کر ڈالا تھا۔ اختر عثمان کہتے ہیں کہ پتھر کے اُس دور میں تو ایک قابیل تھا جس نے وحشت پھیلائی لیکن اب ساری دنیا اُسی وحشی پن کو اپنا چکی ہے اب چاہے وہ انسان کا انسان کے ساتھ رویّہ ہو یا اپنے اِرد

گِرد کے ماحول کے ساتھ لیکن انسانیت میں وحشی پن بھر گیا ہے۔ پتھر کے اُس دور سے اتنا دُور آ جانے کے بعد بھی انسان ویسا ہی ہے اور اتنے طویل وقت کے بعد بھی اُس نے کچھ نہیں سیکھا۔ شمس الرحمان فاروقی اس نظم کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ "یہ نظم پتھر سے جدید زمانے کا احاطہ کرتی ہے۔"(۹۵)

فرقہ واریت کی مخالفت:

کسی بھی قوم کے زوال کے لئے اسکا بَٹ جانا کافی ہوتا ہے جہاں سے اُسکا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والا ہر شخص ایک برابر ہے اور تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی قرار دیا گیا ہے جس میں کسی ایک کو کسی دوسرے پر سوائے تقویٰ کے برتری حاصل نہیں ہے۔ آج کے دور میں فرقہ واریت عام ہو چکی ہے مسلمانوں کے آپس کے اختلافات کی بناء پر جماعتیں بن چکی ہیں۔ جن کو سامنے رکھتے ہوئے شاعر نے پھر سے اصل حقیقت کی طرف انسانیت کا دھیان کھینچنے کی کوشش کی ہے۔

بقول جواد ہمدانی:

> "تراش اس لیے کبھی معرب اور کبھی مفرس کبھی ہندی اور کبھی مغربی رنگ میں رنگی جاتی ہے کہ اپنے قاری کو پیغام دے سکے اگرچہ انسان زبانوں علاقوں فلسفوں اور نظریوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن سب انسانیت کی کتاب کے متن گراں بہا کا حصہ ہیں۔"(۹۶)

شاعر طبقاتی کشمکش، تفاوت، دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کے خلاف ہیں۔ نظم نگار کہتا ہے کہ تم تقسیم کیوں ہوتے ہو؟ کیوں طبقات بناتے ہو؟ یہ تمام فرقے چھوڑ کر ایک ہو جاؤ۔ جو غلطیاں تم سے ہوئیں سدھر جاؤ مساوات کے علمبردار بن جاؤ ایک ہو جاؤ۔

تم ایک ہو تو یہ فرد نا فرد کے سلاسل اتار پھینکو
نگارِ صبحِ عظیم غُرفے کی اوٹ میں کب سے منتظر ہے(۹۷)

انسان کی غارت گری:

تراشنے کے معنی چھیلنے کے ہیں۔ تراش خراش کر کے انسان ایک خوبصورت مجسمہ تو تیار کر سکتا ہے لیکن وہ حقیقت سے دُور اور بناوٹی خوبصورتی ہے۔ گزرے زمانوں کی بات کرتے ہوئے پُرانے تمام سُرخ پنّے

کھول کر شاعر انسان کی غارت گری پر روشنی ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کی فطرت میں وحشی پن ہے وہ بے ضرر پنچھیوں کا شکار کرتا ہے، اُنکو قید کرتا ہے، بیچتا ہے۔ باغ میں داخل ہوتے ہی جہاں چمن کی خوشبو اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے روح پُر سکون ہو جاتی تھی اب وہاں آدمی گھات لگائے اور جال پھیلائے بیٹھا ہے۔ اختر عثمان کہتے ہیں کہ آخر کیوں انسان ایسے غلیظ دھندوں میں مبتلا ہے کیا اُسے نہیں پتا کہ اُس کا کیا مقام ہے۔ بس یہی افسوس کرتے ہوئے شاعر خفگان کے عالم میں اشعار کچھ یوں لکھتا ہے۔

یہ پنچھیوں کے گرسنہ غول اور خسیس، خونیں، خبیث بندے، سیاہ دھندے

سواد گلشن کے چار جانب لگے ہوئے خار دار پھندے، مہیب دندے

مرے تئیں تیز تازیانے، تمام تاریخ کے پلندے غلیظ، گندے[۹۸]

خطبہ حجّتہ الوداع:

ہمیں عطا کیا گیا دینِ اسلام ایک مکمل دین ہے جس میں انسانی مسائل کا حل بِلاشُبہ موجود ہے۔ ہمیں بحیثیت مسلمان قرآن اور سُنّت دونوں نصیب ہوئے ہیں۔ اللہ کے آخری رسول کے پہلے اور آخری حج کے دوران مسلمانوں کو دیے گئے پیغام کو یاد کیجئے جس میں سراسر انسانی حقوق، برابری اور مساوات کا ذکر کیا گیا ہے۔ تراش کے مضامین کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو خطبہ حجّتہ الوداع میں جو پیغام رحمت العالمین ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اُن تمام کا عکس نظر آتا ہے۔

بقول اختر عثمان:

"اس نظم کا موضوع عظمت انسان ہے۔ یہ معاشرتی عدم مساوات کا تجزیہ کرتی ہے۔
رسول پاک کا خطبہ حجتہ الوداع منظوم کیا گیا ہے۔ وہ میرے نزدیک انسانیت کا منشور
ہے۔"[۹۹]

مختلف مذاہب کا ذکر:

انسان کو بڑائی اور فضیلت اللہ ربّ العزّت نے بخشی، اب وہی انسان اپنے رب کی بڑائی بیان کرے بھی تو کیسے مگر پھر بھی شاعر نے کُفر کو بے نقاب اور رسوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں لیکن ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ دینِ اسلام ہی تمام عالم کی حقیقت ہے۔ یہاں شاعر لکھتا ہے کہ چاہے کوئی

بُت پَرست ہے یا آتش، سورج یا کسی فرعون کی پوجا کرنے والا ہے وہ تمام خود پر ایک جُھوٹا لِبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور جِس خُدا کی وہ پوجا کرتے اور اُس پر جان نچھاور کرتے ہیں وہی اِن کی شکست کا سبب ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جسکو ہم نے خُدا بنا رکھا ہے وہ خود کسی اور کی تخلیق ہے اور کائنات تخلیق کرنے والا خود کسی دوسرے کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اِن جھوٹے ریاکار تاریخ نگاروں کو معلوم ہے کہ ہمیں مٹّی میں جاملنا ہے اور وہاں اُن کا جُھوٹا خُدا اُنکے کسی کام نہ آئے گا اور کیڑے مکوڑے اُنہیں کاٹ کھائیں گے۔

۔۔۔۔یہ جانتے ہیں کہ ان پہ طاری طلسم ٹوٹا تو چیونٹیاں اِن کا ریشہ ریشہ اُدھیڑ دیں گی
یہ خوف و وحشت میں دم بخود ہیں، بخود خزیدہ ہیں، جانتے ہیں کہ اژدرِ وقت راہ میں ہیں۔[۱۰۰]

تاریخی واقعات کا ذکر:

تاریخ ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کو کو سبق دیتی ہے۔ جدید دور میں موجودہ مسائل اور معاشرتی عدم مساوات کی بات کرتے ہوئے شاعر تاریخ کے کچھ تلخ پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور ابن آدم کے گزرے زمانے کا نئے زمانے سے موازانہ کرتے ہوئے ان تمام باتوں کو چن چن کر بیان کرتا ہے جو آج کی دور سے پہلے بھی ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کرتا آیا ہے۔ اِس نظم میں اختر عثمان نے کئی تاریخی پہلوؤں کو چھیڑا ہے جن میں قابیل کے ہاتھوں اپنے ہی بھائی کا قتل، انسان کا وحشی پن، گُزرے وقت کے دِلکش نظارے اور ساتھ ہی ساتھ عالمی شُہرت رکھنے والے ادیب اور فنکار کا تذکرہ شامل ہے۔ اِسی طرح انسانیت کی خدمت کرنے والی کچھ شخصیات کا بھی ذکر شاملِ نصاب ہے جو اَب تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں جیسا کہ ارسطو، ابنِ سینا سٹائن وغیرہ کا نام لے کر شاعر کہتا ہے کہ اِن شخصیات نے انسانیت کی خدمت کے لئے محنت کی اور اپنے کام سے علم اور ایجادات کا حُسن دُنیا بھر میں بانٹتے ہوئے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

ابھی جوارِ خراب آباد میں کوئی باس ہے کہ میں ہوں
وہ کوئی پانینی و حمورابی و ارسطو و ابنِ سینا و ابنِ رُشد و برونو و
ارشمیدس و مارکس ہو، سٹائن ہو
آج تک سب یہاں وہاں حسن بانٹتے ہیں[۱۰۱]

شاعر ایک جگہ اہرام کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اہرام مصر کا شمار انسان کی بنائی ہوئی عظیم ترین تعمیرات میں ہوتا ہے۔ یہ اہرام زمانہ قدیم کی مصری تہذیب کے سب سے پر شکوہ اور لافانی یادیں ہیں۔ شاعر

کہتا ہے کہ زمانے کے دکھ اور تکلیفیں اس طرح ہیں جیسے اہرام مصر۔ ان اہرام کو دیکھ کر میرے ذہن میں سوال آتا ہے کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہے۔ کوشش، لگن اور کاریگری سے انسان سب کچھ اپنے زیر کر سکتا ہے۔

فلسفیانہ رنگ:

فلسفہ یونانی لفظ "فلوسوفی" سے نکلا ہے جس کے معنٰی حکمت سے محبت کے ہیں۔ یہ محض لفظی معنٰی ہیں اور آج تک اِس لفظ کی صحیح معنوں میں تعریف کرنا ممکن نہ ہو سکا ہے۔ عام الفاظ میں بیان کیا جائے تو کسی بات کے پیچھے چُھپی اصل حقیقت کو فلسفہ کہتے ہیں جو پڑھنے والے کو یہ احساس دلائے کے اِس عبارت کا مقصد لفظی معنٰی نکالنا نہیں بلکہ گہرائی میں جانے پر اصل مقصد معلوم ہوتا ہے۔ تراش بھی ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں شاعر نے فلسفی انداز اپناتے ہوئے لوگوں تک اپنے جذبات پہنچانے کی کوشش کی ہے جس میں دولَوں کا آپس میں بات کرنا وغیرہ شامل ہے یہاں لَووں سے مراد آشا اور اُمید کی کرنیں ہیں جنہوں نے دَر حقیقت شاعر کے دِل میں جنم لیا ہے۔ تراش فکر و فلسفہ کی پیچیدہ گھاٹیوں میں اترتے ہوئے نظر آتی ہے۔

بقول یوسف حسن:

> "موضوعات کے تغیرات کے ہمراہ شاعر کے اس نفسیاتی آہنگ میں تنوع ضرور ہے مگر بکھراو نہیں اور یہ نفسیاتی متنوع اتار چڑھاؤ سے گزرتا ہوا ہوا ہمارے اندر سرایت کرتا ہوا آخر میں ایک متوازن و مناسب کل تشکیل دیتا ہے اور نوع انسانی کے خارجی و داخلی نشوونما کے سفر میں ہمیں نئے آفاق کی تخلیق کے لئے متحرک کر دیتا ہے۔"(۱۰۲)

میں آپ گرئیدن و شنیدن کے دکھ سے گزرا ہوں
جانتا ہوں کہ تیشہ لاکھ سہج جھیلے رگوں کے لاوے کی بورش بے پناہ بے حد سے ناشناسا ہوں
سنگ وحشت صفت کا خوگر (۱۰۳)

عالمی ادب کا حوالہ:

ادب کی دُنیا میں کئی نام ہیں جو اپنے بعد آنے والوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں اور سیکھنے والوں کے لئے یہ ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ شاعر نے آج کے ادیب کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے اور گُزرے ہوئے نامی

گرامی اشخاص کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ آج اگر ادب کی دُنیا میں یہ خوبصورت پارے ڈھل پائے ہیں تو ان میں مانی، اینجلو، روم، خیّام، انیس اور فردوس جیسے کئی عالمی شہرت یافتہ ادیبوں کی محنت شامل ہے۔

یہ چوب وسنگ ایسے تیشہ وخامہ سے ملے ہیں کہ قیس و آزر کا میل تمثیل میں ڈھلا ہے۔۔۔
یہ حافظ ومیر کے فسانے متاعِ احساسِ آدمی ہیں[۱۰۴]

فلسفہ وجودیت:

اس فانی دُنیا میں انسان کا آنا اور اسکا وجود خود ایک فلسفہ ہے۔ کائنات میں اَن گِنت مخلوقات کے ہوتے ہوئے انسان کو اُن سب پر برتری عطا کرنا اور اپنا نائب بنا کر بھیجا جانا جہاں انسان کے لئے قابلِ فخر ہے وہاں قابلِ فکر بھی ہے۔ کسی بھی چیز کا وجود اپنے پیچھے ایک فلسفہ چھُپائے ہوتا ہے جیسا کہ ایک سائنسدان کوئی مشین ایجاد کرے تو اُسکا مقصد کسی خاص کام کو انجام دینا ہوتا ہے۔ ٹھیک اُسی طرح انسان کا وجود بھی اِس لئے تخلیق کیا گیا تا کہ وہ اپنے رَب کا شُکر گزارے اور اُسکی عبادت کرے نہ کہ دُنیاوی شوخ پن میں اپنا جینے کا مقصد بُھلا بیٹھے۔

میں زمرہ کائنات میں سرفراز بھی ہوں
میں آدمیت کے واسطے اعتزاز بھی ہوں[۱۰۵]

نوحہ:

تاریخ گواہ ہے کہ جہاں انسان کی غارت گری اور سیاہ دھندوں کے نشان ملتے ہیں وہاں ایسے لوگ بھی تاریخ میں اپنی چھاپ چھوڑ گئے ہیں جنہوں نے انسانیت کے لئے نئی مشعلیں جلائیں، انسان کی مشکلات کو آسانیوں میں تبدیل کرنے کے لئے اپنے دِن رات وار دیے، جنہوں نے بَٹے ہوئے انسانوں کو ایک کرنے کی کوششیں کیں اور جو اندھیروں میں بھی روشنی کی کرنیں تلاش کرتے اور جگاتے رہے۔ شاعر یہاں افسوس کرتا ہے کہ وہ لوگ جو انسانیت کے غم گسار تھے اور جِن کی وجہ سے معاشرے میں توازن برقرار تھا اب وہ نہیں رہے۔ نگاہیں اُن ہستیوں کو ڈھونڈتی ہیں مگر جب وہ نہیں ملتے تو نوحہ کرنے کے سواء اور کچھ نہیں رہتا۔

ستارہ سازانِ نیم شب، نیلمیں تحیّر بنانے والے

وہ شب چراغوں کو جی کا روغن پلانے والے[۱۰۶]

اختر عثمان کے موضوعات روایتی انداز و فکر سے بہت آگے انسان کی ماضی و حال کی مجموعی تاریخ، تہذیب، نظریات، نفسیاتی و سماجی تناظر میں کلام کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اپنی نظم کے بارے میں اختر عثمان کی رائے یہ ہے کہ

> "پوری محنت کی اپنی طرف سے اس نظم کے لیے۔ اس نظم کو شمس الرحمن فاروقی، خورشید رضوی، افتخار عارف، تحسین فاروقی، احسان اکبر سے لے کر ڈاکٹر صلاح الدین درویش تک گزشتہ پچاس سال کی بہترین نظم قرار دیا گیا ہے۔"[۱۰۷]

نظم فنی حقیقت پسندی کے جدید منہاج میں کہی گئی ہے۔ جس میں کسی مظہر یا مظاہر کے جوہر کو قوانین حسن کے مطابق پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اردو میں شاعری ہیت کے مروج معنی میں ایک کثیر الہیت نظم ہے۔ افتخار عارف اس نظم کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ "پچھلے دو تین عشروں میں شائع ہونے والی طویل نظموں میں شاہد ہی کوئی نظم ایسی ہو گی جو تراش کے سامنے ٹھہرتی ہو گی۔"[۱۰۸] تراش آزاد ہونے کے باوجود معنوی اور فکری حصار میں قید ہے۔ نظم میں گہرے اور وسیع موضوعات کو نہایت جامع اور مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے جو بے مثال ہیں۔ اختر عثمان نے نامعلوم زمانوں کی جستجو کی پھر ان کی شناخت کے بعد ان کے آثار و رفتار کے حدود متعین عمدگی سے کیے۔

زیر بحث طویل نظموں کے نظم نگاروں نے تاریخ انسانی سے لے کر گہرے اور فلسفیانہ موضوعات کو احساسات کی ترجمانی میں ایسی خوبی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کا دل ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ ان نظموں میں قدیم دور سے اب تک کی انسانی تاریخ عمدگی سے آشکار ہوتی نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

1. فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو فسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات ،پورب اکادمی ، اسلام آباد ، ۲۰۰۷ء، ص۱۹
2. یوسف حسن، اردو نظم کے پچاس سال مشمولہ عبارت، ان، م ن، س ن، ص ۹۴، ۹۳
3. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۱۱۹
4. ایضاً
5. دانیال طریر، طویل نظم "نوحہ گر "پر ایک تنقیدی نظر ، مشمولہ گرہ کھلنے تک ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ، ۲۰۱۳ء، ص۱۴۱
6. محمود علی سڈنی، ڈاکٹر، فلسفہ سائنس اور کائنات، الفصیل ناشران، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۶۳
7. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۴، ۱۳۳
8. ایضاً، ص ۱۳۶
9. سعید ابراہیم، مضمون مشمولہ گرہ کھلنے تک، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۱۴۱
10. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۷
11. ایضاً، ص ۱۳۳
12. سعید ابراہیم، مضمون مشمولہ گرہ کھلنے تک، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۱۴۱
13. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص۱۱۹
14. ایضاً، ص ۱۴۰
15. شہزاد نیئر، راقمہ سے گفتگو، ۲۵ جنوری ۲۰۱۹ء، راولپنڈی
16. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضا، ص ۱۴۰
17. ایضاً، ص ۱۳۹
18. جلیل عالی، گرہ کھلنے تک کی فکری و شعری دھن، ادب لطیف، ماہنامہ، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۸۷
19. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۹
20. ایضاً، ص ۱۲۵
21. دانیال طریر، ایضاً، ص ۱۴۴
22. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۰

23. جلیل عالی، گرہ کھلنے تک کی فکری و شعری دھن، ادب لطیف، ماہنامہ، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۸۸
24. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۱، ۱۳۰
25. ایضاً، ص ۱۳۲
26. ایضاً، ص ۱۲۴
27. ایضاً
28. ایضاً
29. ایضاً، ص ۱۲۵
30. ایضاً، ص ۱۲۶
31. ایضاً، ص ۱۳۹
32. خالد اقبال یاسر، جدید تحریکات اور اقبال، حاجی حنیف پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲۹
33. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۰
34. شہزاد نیئر، راقمہ سے گفتگو، ۲۵ جنوری ۲۰۱۹ء، راولپنڈی
35. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۹
36. خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۱۴ جنوری ۲۰۲۰ء، راولپنڈی
37. سیتہ پال آنند، ڈاکٹر، دیباچہ، تمثیل، شاخسار پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۴ ستمبر ۲۰۱۵ء
38. ایضاً
39. خاور اعجاز، تمثیل، شاخسار پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۲
40. ایضاً
41. ایضاً
42. ایضاً، ص ۳
43. سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر ۷۰
44. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۴
45. ایضاً
46. سعید، امتیاز احمد، اسلامی تہذیب و تمدن نیو بک پبلشرز، س ن، ص ۱۵
47. خاور اعجاز، تمثیل، ایضا، ص ۳

48. ایضاً، ص۶

49. ایضاً، ص۹

50. ایضاً، ص۱۱

51. ایضاً، ص۲۰

52. ایضاً، ص۲۴

53. ایضاً، ص۲۲

54. http//: www.facebook/khawer ijaz

55. خاور اعجاز، تمثیل، ص۴۰

56. ایضاً، ص۲۷

57. ایضاً، ص۳۰،۲۹

58. خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۱۴ جنوری ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

59. http//: www.facebook/khawer ijaz

60. خاور اعجاز، تمثیل، ص۴۵

61. سورۃ اخلاص آیات ۱ تا ۴

62. خاور اعجاز، تمثیل، ص۳۱

63. خاور اعجاز، تمثیل، ص۳۲،۳۱

64. http//: www.facebook/khawer ijaz

65. خاور اعجاز، تمثیل، ص۳۵

66. ایضاً، ص۶۰

67. سیتہ پال آنند، ڈاکٹر، دیباچہ، تمثیل، شاخسار پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۴ ستمبر ۲۰۱۵ء

68. خاور اعجاز، تمثیل، ص۴۰

69. http//: www.facebook/khawer ijaz

70. خاور اعجاز، تمثیل، ص۶۶

71. ایضاً، ص۵۹

72. خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۱۴ جنوری ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

73. خاور اعجاز، تمثیل، ص۶۷،۶۶

74. ایضاً، ص۶۰

75. http//: www.facebook/khawer ijaz

76. خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۱۴جنوری ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

77. خاور اعجاز، تمثیل، ص۵۶

78. ایضاً، ص۳۶

79. خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۱۸مارچ ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

80. سرور جاوید، اردو نظم کی عظیم روایت، دنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، جولائی ۲۰۱۴ء، ص۲۵

81. اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۶نومبر ۲۰۱۹ء، 1:00PM

82. سورۃ یسیں، آیت ۱۸۹

83. اختر عثمان، تراش، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء، ص۱۵

84. ایضاً، ص۱۷

85. سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۰

86. اختر عثمان، تراش، ایضا، ص۳۴

87. ایضاً، ص۲۹

88. جواد ہمدانی کے تاثرات

89. اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۶نومبر ۲۰۱۹ء، 1:00PM

90. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص۲۷

91. ایضاً، ص۳۸،۱۵

92. ایضاً، ص۲۴

93. خورشید رضوی کے تاثرات

94. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص۲۵

95. شمس الرحمان فاروقی، تاثرات، الہ آباد، دسمبر ۲۰۱۳ء

96. جواد ہمدانی کے تاثرات

97. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص۳۶

98. ایضاً، ص ۳۱

99. اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۵ اپریل ۲۰۱۹ء، 4:00 PM

100. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۲

101. ایضاً، ص ۳۵

102. یوسف حسن، دیباچہ تراش، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳

103. اختر عثمان، تراش، ایضا، ص ۱۶

104. ایضاً، ص ۳۲

105. ایضاً، ص ۳۴

106. ایضاً، ص ۳۳

107. افتخار عارف، تاثرات، ۲۹ مئی ۲۰۱۸ء

باب سوم:

تین معاصر طویل نظموں کے اشتراکات کا جائزہ

تقابل:

تقابل سے مراد موازانہ کرنا اور مقابلہ کرنا ہے۔ تقابل بنیادی طور پر دو مشترک بنیاد رکھنے والی چیزوں کے موازنے کا نام ہے۔ دو مختلف قوموں کے تحت لکھے گئے ادب کا مطالعہ تقابلی مطالعہ کہلاتا ہے۔

سوزن بیسٹ تقابلی ادب کی تعریف کرتے ہیں کہ

> "تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے ایک کثیر العلمی مضمون ہے جس کا تعلق زمان و مکان کے بعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش سے متعلق ہے۔"(۱)

دو چیزوں کے درمیان موازانہ خصوصا یہ جاننا ہوتا ہے کہ ان میں کیا خصوصیات مماثل ہیں اور کیا غیر مماثل۔ ہر دور میں تقابلی مطالعہ کی ضرورت کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل رہی۔ یہ کہیں معاصرین کے درمیان ہوتا ہے تو کبھی قدیم جدید ادیبوں کے مابین ایک فکری اور موضوعاتی سطح پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کہیں اس کی ضرورت مختلف ادوار کے موازانہ کی صورت ابھرتی ہے۔ اس کے باعث مختلف رویوں کی ایک ہی عہد اور اس کے حوالے سے اختلاف کی نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس بات سے انکار ممکن ہی نہیں کوئی بھی تحریر چاہے تنقید سے اس کا تعلق ہو یا تحقیق سے اس کا اختتام تقابل پر ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی تحریر کی قدر کا تعین کرنے کے لیے تقابل بہت ضروری ہے۔ جب تک ایک فن پارے کا تقابل دوسرے فن پارے سے نہیں کروایں گے تو اس کی خوبیاں سامنے نہیں آسکتیں۔ تقابلی جائزے کی بدولت کسی ادیب یا ادب کو چھوٹا یا بڑا، کمتر یا برتر ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس سے نئے فکری و عصری حوالے اور صحت مند رویے سامنے آتے ہیں۔ تقابلی مطالعے سے تحقیق و تنقید کی نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس سے موضوعات میں وسعت اور جدت پیدا ہوتی ہے۔ دو مختلف معاشروں کے ادباء کے رویے اور مزاج سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی سوچ، شخصیت اور مزاج سامنے آتا ہے۔ اس سے ادب کے نمایاں اور پنہاں گوشوں سے رہنمائی حاصل ہوتی

ہے۔ تقابلی مطالعے سے تہذیب و ثقافت اور نظریات سے آگاہی کے ساتھ ساتھ ادب کے اشتراکات اور افتراقات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

اشتراکات:

شاعری انسان کی روح کو چھونے والا ایک نفیس طریقہ ہے جس کے ذریعے شاعر لوگوں تک اپنے نظریات اور سوچ منتقل کرتا ہے اور برصغیر کو اللہ رب العزت نے بہت سے باکمال اور عمدہ شاعروں سے نوازا ہے جنھوں نے اپنے انداز بیان سے نہ صرف دین اسلام کے فروغ کے لیے کام کیا بلکہ عوام کو نئے دور میں سر اٹھاتے مسائل کی طرف غور و فکر پر بھی مجبور کر دیا۔

"نوحہ گر"، "تراش" اور "تمثیل" تین الگ شعراء کی نظمیں ہیں اور چونکہ تینوں شاعر دور جدید سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشرے میں پھیلی بگاڑ، انسانی ناروا رویے گزرے وقت کے انمول لمحات کو مد نظر رکھتے ہوئے تینوں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اس لیے ایک جیسی سوچ، فکر اور حالات ہونے کی وجہ سے تینوں نظموں کے موضوعات کافی حد تک میل کھاتے ہیں۔ تینوں نظموں میں سے اشتراکات کو چن کر مختلف نکات میں بیان کیا گیا ہے۔

تاریخِ انسانی:

برٹرینڈ رسل گویا سین تاریخ کی تعریف کرتے ہیں کہ "تاریخ صرف اس بات کا جواب ہے کہ اس کائنات میں واقعات کیسے رونما ہوئے"[۲] تاریخ ایک ایسا جز ہے جو انسان کی زندگی میں بہت معنی رکھتا ہے کیونکہ تاریخ اسے اس کے آباؤ اجداد اور گزرے زمانوں کی تہذیب و تمدن سے آگاہی بخشتا ہے۔ نظم "نوحہ گر"، "تراش" اور "تمثیل" کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو ہمیں با آسانی اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں نظموں میں شعراء نے آغاز آفرینش سے اب تک کی تاریخ انسانی اور انسان کی جابرانہ فطرت کا موضوع چھیڑا ہے۔ بدیں وجہ انسانی روداد بھی اشتراقی طور پر بیان کی گئی ہے۔ شعرا نے انسان کی دنیا میں آمد اللہ تعالی کا انسان کو عظمت بخشنا وغیرہ کا بیان اور ساتھ ہی انسان کی ترقی کے کئی مناظر اور باغی ہو کر اس خوبصورت دنیا میں تباہی مچانے کے کچھ واقعات اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھے ہیں۔ اختر عثمان انسان کی آمد اور پھر انسان کے ہاتھوں ماحولیات کی تباہی اور بربریت کی داستان نظم تراش میں یوں بیان کرتے ہیں:

زمین آباد ہو رہی تھی
شجر، ہجر دشت و در، پرندوں کے آشیانے، وحوش
کے سب ٹھکانے برباد ہو رہے تھے(۳)

خاور اعجاز اپنی نظم تمثیل میں ریشم کا لباس پہنے انسان کی زمین پر وارد ہونے اور اس کی تباہی کی کہانی یوں سناتے ہیں:

زمانے!
مرے ٹاٹ کے کارخانے میں
گزرے مناظر کا تھوڑا سا ریشم پڑا ہے
جسے عہد حاضر کی دیمک
برادے میں تبدیل کرتی چلی جا رہی ہے(۴)

اسی طرح نظم نوحہ گر میں شہزاد نیئر کہتے ہیں کہ غاروں میں رہنے والا انسان اب اتنا ترقی کر چکا ہے اس نے جدید سائنسی ٹیکنالوجی دریافت کی۔ انسان کی خطرناک ایجاد ایٹم بم کا ذکر کرتے ہیں کہ جس کے استعمال سے بڑے پیمانے پر خون ریزی ہوئی۔

جب وہ سورج پھٹا
میری مالا کے دانے دھڑا دھڑ گرے!۔۔(۵)

انسانی تہذیبی سفر:

انسان نے لمحہ بہ لمحہ فکری ترقی کے راستے پر قدم بڑھائے ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

جیسا کہ زیر موضوع تینوں نظموں میں انسانی زندگی زیر بحث رہی ہے۔ اس لیے انسانی ارتقاء اور انسان کا تہذیبی سفر بھی شعرا نے اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور تینوں نظموں میں انسانی زندگی کی شروعات اور پھر آگے چل کر تہذیب و تمدن سیکھنا بتایا گیا ہے کہ کیسے انسان دنیا میں آیا، مٹی

سے بنا اور پھر اس نے وقت کے ساتھ ساتھ طور طریقے اپنائے جو نسل در نسل آگے منتقل ہوتے ہوئے آج اس کو اس مقام تک لائے۔ انسان جب اس دنیا میں آیا تو اُس نے اپنے بچاؤ اور زندہ رہنے کے لئے اپنے آس پاس کی چیزوں کا سہارا لیا چاہے وہ جاندار ہوں یا بے جان۔ نظم نگاروں نے انسانی زندگی کے ارتقاء کو دردمندانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ انسان نے زمین پر قدم رکھتے ہی وحشت پھیلانا شروع کر دی۔

تراش میں نظم نگار لکھتا ہے:

ابھی یہ اترا ہی تھا کہ معصوم فاختہ کے سلگتے سینے پہ ایک پتھر اٹھا کے مارا
لہو لہو فاختہ گری تو اسے یکا یک ادھیڑ ڈالا۔۔
کچر کچر کی صدائے وحشت (۶)

تاریخ کے حوالے سے انفرادی عمل یہ رہا ہے کہ جب سے حضرت انسان نے زندگی کو پایا اور ضروریات زندگی کے لیے تگ و دو کی اور سہولیات کے حصول کے کھٹن مگر امید افزاء سفر کا رخت باندھا جس کے ضمن میں اکائی، جذبات اور احساسات اور زندگی کے اظہار کی بنیاد رکھی گئی اور ان سے استفادی اور افہام و تفہیم کا عمل نمو پایا۔ جس کی وجہ سے انسانی ارتقا کو حرکت و سمت ملی، ان تمام عوامل کو مہارت اور لطافت سے نظم کیا گیا ہے۔

نوحہ گر میں انسانی ارتقا اور تہذیب کے شروعاتی دنوں کو کچھ یوں بیان کیا گیا ہے

نامیاتی ازل سے ابد کی طرف جل تھلی رینگتے تھے
اگر کوئی لمحہ ڈراتا تو پھر بہ نکلتے (۷)

تمثیل میں خاور اعجاز ارتقا کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں

چودہ صدیوں سے آنکھیں بھگوتے ہوئے
وقت کے غار سے پھر گزرتے ہوئے سوچتا ہوں
کہ آج اور کل کے مناظر میں
کیا ربط ہے (۸)

قبل از آفرینش سے آغاز:

آفرینش فارسی زبان سے اخذ کیا گیا لفظ ہے جس کے معنی پیدا ہونے یا تخلیق کے ہیں۔ اشتراقی طور پر نظموں کا آغاز انسان کی تخلیق سے پہلے کا دور بیان کر کے کیا گیا ہے۔ نظم نگاروں نے نظم کا آغاز اس منظر نامے سے کیا جہاں ہر طرف ہو کا عالم، تیرگی، خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ نوحہ گر کا شعری اقتباس ملاحظہ ہو:

روشنی تیرگی سمت آواز۔۔۔۔سب نیستی[۹]

تمثیل کا آغاز یوں ہوتا ہے:

بے ہیئت اک تیرگی کے سمندر سے
پہلی کرن روشنی کی گزرتی ہے[۱۰]

اسی طرح نظم تراش میں بھی لاوقت میں مکالمہ ہو رہا ہے۔ ساعت صفر سے بظاہر کوئی خیالی وقت یا وقفہ مراد ہے، کیونکہ متکلم جن الفاظ کو سن رہا ہے وہ سکوت سے پیدا ہوئے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں

سکوت فردادی کے سونے سمے میں بھولی لویں بیانات بن رہی ہیں
میں اپنی سنجوگتا کے ہمراہ ساعت صفر میں سب الفاظ سن رہا ہوں[۱۱]

انسان کا ظہور:

انسان کا دنیا میں آنے اور اللہ کا نائب بننے میں انسان کی جو عظمت ہے وہ خود انسانی وجود سے آغاز لیتی ہے کیونکہ اللہ پاک فرماتا ہے انسان کا وجود میری واحدانیت کی دلیل ہے۔ جہاں تک تخلیق انسان اور دیگر جانداروں کی تخلیق کی بات ہے اس سلسلے میں قرآن کا یہ قول بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ "اور ہم نے ہر چیز کو پانی میں زندگی دی"[۱۲] تینوں نظم نگار اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ زندگی کا وجود سب سے پہلے سمندر میں ہوا۔ انسان کی عظمت کے ساتھ انہوں نے انسان کے ظہور کی کہانی لکھی ہے۔ نوحہ گر میں شاعر انسان کی دنیا میں آمد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اپنے کنارے سے چمٹا ہوا
لاوجودی چٹانوں کے پھیلے ہوئے کالے پن میں
زمان و مکان سے لتھڑتے ہوئے۔۔۔۔

دیکھتا تھا۔۔۔نہ ہونے سے ہونا[۱۳]

انسان کے پیدا کیے جانے سے پہلے کائنات کی تخلیق پھر اللہ رب العزت کا انسان کو مٹی سے بنانا اور اسے زمین پر بھیجے جانے کا منظر تینوں نظموں میں اشتراقی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

میں آئینہ دیکھ دیکھ کر تم کو چھیلتا تھا
نسائی پیکر میں کون ہے
کوئی تو بتائے![۱۴]
پھر تو نے مجھے
یہ مٹی کا پیکر عطا کر دیا
کیا سے کیا کر دیا[۱۵]

امن کی خواہش پر اختتام:

ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے خیال میں "قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کی قوم کا رجائیہ ہونا ضروری ہے۔"[۱۶] زیر بحث نظمیں انسانی ارتقا، تہذیب آرائی، نت نئی تخلیقات اور انسان کے ہاتھوں دنیا کی تباہی کی بات کرتی ہیں۔ شعراء اپنے دل کا حال اپنی شاعری میں اتارتے ہوئے جہاں تاریخی واقعات اور تلخ ماضی کی یادوں کو نئی نسل کے سامنے رکھا ہے وہاں امید کی کرن بھی دکھائی ہے۔ نظم کے اختتام پر قتل و غارت گری، تباہی اور بربادی کے خاتمے کے ساتھ امن اور شانتی کی زندگی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں دنیا امید پر قائم ہے اور یہ امید ہے جو ہمیں خیر اور شر کی لڑائی میں نظر آتی ہے۔ تینوں نظموں میں یہ بات مشترکہ طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ شاعر حضرات برے حالات سے مایوس نہیں بلکہ مستقبل میں وہ پر امید ہیں کہ دنیا بربریت کی راہ سے ہٹ کر امن کی راہ اپنائے گی۔

میرا قافلہ راستے میں کھڑا تھا
کہ تو ایک دن میرا سورج اچھالے گا
اور مجھ کو راتوں کے غم سے نکالے گا[۱۷]

خاور اعجاز کے نزدیک آج کا مسلمان بے شمار مسائل کا شکار ہے جبکہ اسے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں لیکن پھر بھی جینے کی امنگ ہے وہ جینا چاہتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں

دنیا نے مجھ کو اگر روند ڈالا تو کیا
میں نئی گردشوں کے افق سے ابھر آؤں گا
دنیا دیکھے گی اور میں نظر آؤں گا
اس کے ہاتھوں ابھی زخم کھایا ہوا ہے(۱۸)

شاعر نوحہ گر میں قتل و غارت کی مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس تباہی بربادی کو روک لو کہیں ایسا نہ ہو کہ نسل انسانی نابود ہو جائے۔ پھر مجھے انتظار کرنا پڑے کہ انسان پھر اس مقام پر پہنچے جہاں اتنے سالوں کے بعد پہنچا ہے۔

پھر مجھے منتظر بیٹھنا ہو گا
پیچیدہ ہوتی ہوئی اتنی انواع میں
کون جوڑا قدم ایک اوپر دھرے
سوچنے کا پھر ایک بار آغاز ہوا(۱۹)

انفرادیت سے اجتماعیت کی آواز:

شاعر اپنی فرضی کرداروں کی مدد سے ساری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے اور اس فن کی مدد سے فرضی کردار انفرادی حیثیت رکھتے ہوئے اجتماعی آواز بن کر ابھرتے ہیں۔ جیسا کہ نظم تراش میں سنجو گتا کا کردار ایک واحد کردار ہے، نظم نوحہ گر میں نوحہ گر اور تمثیل میں واحد متکلم بھی ایک واحد کردار ہے لیکن اس کے باوجود نظم کے اختتام میں یہ کردار ساری انسانیت کی آواز بن کر سامنے آتے ہیں۔

فلسفیانہ نقطہ نظر:

فلسفہ ادراکِ و تعقل کے انتقاد کا علم ہے۔ فلسفہ ایک الجھے ہوئے خیال کا نام ہے جسے سمجھنے کے لئے غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ لکھائی میں فلسفیانہ رنگ کا ہونا ایک ہنر ہے جسے تینوں نظم نگاروں نے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ اختر عثمان، خاور اعجاز اور شہزاد نیئر کے اندازِ بیان میں اشتراکیت ہونا ان کے ہم خیال ہونے کو ظاہر کرتا ہے جیسا کہ گزشتہ بحث میں ذکر کیا گیا ہے کہ شاعر حضرات ملک و قوم اور اپنے گردونواح میں ہونے والے ظلم اور مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ شاعری کا کام بھی نرم

مزاج اور ہمدرد افراد کا کام ہے۔ اس لئے زیر بحث نظموں میں فلسفیانہ رنگ کا ہونا ایک طرف تو شاعری میں کمال ہے اور دوسری جانب خیالات کی ہم آہنگی ہے جو موجودہ وقت اور حالات کے سانچے میں ڈھل کر الفاظ کی صورت اختیار کر گئی ہے تاکہ لوگوں تک وہ اصل خیالات منتقل ہو سکیں جو ان شعراء کی کاوش رہی۔ تینوں نظم نگار غم کا فلسفہ بیان کرتے ہیں:

تیرے وقت کی جالیوں پر
ابھی تک وہی دھند کا سا سماں ہے۔۔۔
یہ جو آسمان پر جھلمل ستارے ہیں
میری ہی پلکوں سے ٹوٹے ہوئے استعارے ہیں[۲۰]
قلہ کوہ کے سنگ بستہ بدن کے قریں
بے پروں کی صدا پھڑ پھڑائی۔۔
اونچی نیچی ڈھلانوں گہری کھائیوں۔۔
پھسلتی، لڑھکتی ہوئی سات جانب چلی[۲۱]

تراش میں نظم نگار کہتا ہے کہ یہ پہاڑ گنگ اور ازل سے گر ہیں۔ ممکن ہے اس سے مراد شاعر کی زندگی کی بے مروتی اور بے حسی ہو اور یہ پہاڑ نہ صرف خود خاموش، بہرے اور گونگے ہیں بلکہ جو آواز ان تک پہنچتی ہے وہ ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ یہ صدا کو اٹھا کر متکلم کے منہ پہ مارتے ہیں۔

یہ کوہ گنگ اور ازل سے گر ہیں
کوئی صدا ہو کوئی سخن ہو یہ بات اٹھاتے ہیں اور پھر منہ پہ مارتے ہیں[۲۲]

نوحہ گری:

انسان کو شعور ملا اور شعور کے ساتھ انسان کے اندر جذبات بھی رکھے گئے۔ خوشی اور غم دونوں انسانی کیفیات ہیں جو حالات کے تناظر کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ چونکہ تینوں نظموں میں انسانی قتل و غارت گری، تباہی، ظلم و بربریت اور گزرے ہوئے حسین زمانے کی یادوں کو تازہ کیا گیا ہے اس لیے شعراء اپنے دکھ اور غم کا اظہار کرتے ہوئے نوحہ گری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تراش میں شاعر ماضی کی ان اعلی شخصیات کا

ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور کوششوں سے محبت بانٹی، علمی کتابیں لکھیں اور نئی نسل کو امن کی طرف راغب کرنے کے لئے بیج بوئے۔

ستارہ ساز ان نیم شب، نیلمیں تحیر بنانے والے
وہ شب چراغوں کو جی کا رون پلانے والے
وہ سطر در سطر، چشم در چشم آس کی فصل اگانے والے
بجھی ہوئی لو جگانے والے
کہاں گئے ہیں![۲۳]

نوحہ گر میں شاعر غمگین لب ولہجہ کا چناؤ کرتے ہو اپنا غم بیان کرتا ہے۔ نظم کہتی ہے انسان نے پوری تاریخ میں انسان کا بہت زیادہ استحصال کیا اور بہت زیادہ قتل کیا۔ تاریخ انسانی میں دیکھا جائے تو چند سال بچتے ہیں جہاں زمین کے کسی نہ کسی حصے میں جنگ نہ ہو رہی ہو۔ دس ہزار سال ہو گئے ہیں جس کی تاریخ ہمارے پاس ہے، جنگیں ہوتی رہیں انسان انسان کا قتل کرتا رہا۔

مجھے خون گننے سے فرصت نہیں
میں تاریخ کا نوحہ گر ہوں۔۔۔۔
جو میری آنکھوں سے بہتے ہوئے خون میں بہہ سکے
میں نے صدیاں گزاری ہیں روتے ہوئے[۲۴]

نظم نگار کہتے ہیں انسان کو جو عظمت دی گی وہ اسے بھلا بیٹھا اور دنیا میں قدم رکھتے ہی کائنات کے اصول توڑتا چلا گیا جو اس کی اپنی تباہی کی وجہ بنے۔ خاور اعجاز واحد متکلم سے نوحہ کرواتے ہیں:

اتنی صدیوں کے قلزم سے گزرا ہوں
یہ تیرگی کا سمندر
میری ساری پونجی بہائے لیے جارہا ہے
میرے موتیوں کے خزانے لئے جارہا ہے[۲۵]

انسان نے غاروں سے اپنے رہن سہن کا آغاز کیا اور پھر وقت کے پہیے نے اسے ایسا گردش میں ڈالا کہ وہ مادی آسائشوں اور خواہشات کی چاہ میں انسانیت کے رتبے سے بھی گر جاتا ہے۔ اس پر تینوں نظم نگاروں نے نوحہ گری کی ہے۔

قتل و غارت گری:

ادیب اور شاعر حضرات زخمی دل غم خوار نظر آتے ہیں کیونکہ وہ گردونواح کے ان پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں جن سے عوام تکلیف میں ہو۔ انسان حقیقت میں اپنی اصل کو بھول چکا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ آدمیت کی معراج جاننے کے باوجود پہچان نہیں پاتا۔ تمثیل، تراش اور نوحہ گر میں شعراء نے انسان کی پھیلائی ہوئی تباہی اور قتل و غارت پر تبصرہ کیا ہے۔ اگر اپنے گردونواح میں نظر دوڑائی جائے تو ہمیں روزمرہ کی زندگی سے بھی انسانی بربریت اور قتل و غارت کی ان گنت مثالیں مل جائیں گی۔ جس میں انسان کا انسان پر ظلم اور انسان کا دنیا کی باقی مخلوقات پر جبر شامل ہے۔ شعراء نے چند ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ نظم تراش میں شاعر انسانی غارت گری کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے

یہ پنچھیوں کے گرسنہ غول اور خسیں، خونیں، خبیث بندے، سیاہ دھندے
سواد گلشن کے چار جانب لگے ہوئے خاردار پھندے، مہیب دندے
میرے تئیں تیز تازیانے، تمام تاریخ کے پلندے غلیظ، گندے[۲۶]

نظم نوحہ گر میں میدان کربلا میں جو قتل و غارت ہوئی اس کا ذکر بھی شاعر نے کیا ہے۔ شہزاد نیئر نے اس قتل و غارت کے کرب اور احساس کا ذکر عمدگی سے کیا ہے۔ یہ کرب، یہ احساس اور یہ درد مندی ہی نظم نگار کی خصوصیات میں شامل ہیں اور نوحہ گر کی تجسیم کا باعث بھی۔

کیسے بھولوں گا میں ان بریدہ سروں کو
جو وحشت کی تسکین کو بہر تفریح کاٹے گئے[۲۷]

انسان نے جانے انجانے میں قدرت کو بہت نقصان پہنچایا اس تباہی کا تذکرہ تمثیل میں بھی ملتا ہے۔

ہر طرف اک الاؤ جلا ہے
کہیں کوئی شعلہ
کہیں بس دھواں اٹھ رہا ہے[۲۸]

تدریجی و تاریخی واقعات کا بیان:

تاریخ نویسی ایک ایسا ورثہ ہے جسے کئی نسلوں سے ساتھ لے کر چلتے ہوئے ادیب ،شاعر اور تاریخ نگاروں نے نئی نسل تک پہنچایا ہے۔زیر بحث نظموں میں جہاں باقی مشترکہ نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے وہاں تینوں نظموں میں تاریخی واقعات کا ذکر بھی واضح ہے۔انسائیکلوپیڈیا میں تاریخ کی تعریف کی گئی ہے:

> "History is the past experience of mankind more exactly history is the memory of that past experience as it has been preserved largely in written records." (29)

کہا جاتا ہے کہ ادیب اور شاعر جو دیکھتے ہیں وہی لکھتے ہیں اور جو آپ بیتی ہوتی ہے وہی الفاظ کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔زیر نظر نظم نگاروں نے تراش ،نوحہ گر اور تمثیل میں تاریخی اور عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے جدید دور کے ساتھ رغبت دی گئی ہے۔ تاریخ سے نامور ادیب، مورخ اور سائنسدانوں کو چُن کر انکی مثال دی گئی ہے۔ کہیں انسان کے رویّے کو نُقطہء بحث بنایا گیا ہے کہیں فطرت کو اور کہیں اسلامی تعلیمات کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ دورِ جدید کے مسلمانوں کو بیدار کیا جاسکے کہ وہ اپنے اُصول اور قاعدے بھُلا چکے ہیں۔

زیر بحث نظموں نوحہ گر اور تراش میں شاعر نے تاریخ سے چن کر دنیا میں پیش آنے والا پہلا درد ناک تاریخی واقعہ بیان کیا ہے۔جب حضرت آدم کے چھوٹے بیٹے قابیل نے اپنے بڑھے بھائی ہابیل کو حسد میں قتل کر دیا تھا۔ یہ وہ واقعات ہیں جو انسان کی قتل وغارت گری اور غرور کی داستانیں ہیں جن کو موضوع بنا کر شاعر نے اپنا فلسفہ بیان کیا ہے۔

جب زمیں کی زباں
آدمی کے نمک سے شناسا ہوئی
سرخ قطرہ برنگ نشانہ گرا(۳۰)

تراش میں سے شعری اقتباس ملاحظہ ہو:

اور ارض قابیل زاد وحشت سے بھر چکی ہے(۳۱)

خاور اعجاز نے بنی اسرائیل کا حوالہ نظم میں یوں بیان کیا ہے۔

زمانے!

من و سلوی آتا رہا کسی کے لیے
پر میرے واسطے دو نوالے گراں ہو گئے ہیں[۳۲]

تصور خدا:

تصور خدا بھی زیر بحث نظموں میں اشتراکی طور پر بیان کیا گیا ہے۔اس کی وجہ ہمارا دین اسلام اور رسول پاک کے بتایا ہوا خدائی تصور ہے۔چونکہ یہ اتنی وسیع بحث ہے کہ اگر تاریخ انسانی میں اس کا ذکر نہ کریں تو بات مکمل نہ ہو گی۔انسان کیوں خدا پر یقین کرے اس کا جواب عبداللہ شاہین یوں دیتے ہیں:

> ''انسان بنیادی طور پر کمزور پیدا ہوا ہے۔اس کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ سے کسی بلند تر ہستی کا متلاشی رہا ہے جو آڑے وقت میں اس کے کام آسکے۔گویا معبود کی تلاش اس کی فطرت سلیمہ کی پیاس ہے اور معبود ہر وہ شے ہو سکتی ہے جسے پکارا گیا ہو، پوجا گیا ہو جس کی چھت تمام مجنوں پر غالب آجائے۔''[۳۳]

نظم نگار کہتے ہیں کہ دور جہالت میں انسان جو غاروں میں رہتا تھا، پتوں سے اپنا بدن ڈھانپتا تھا اور جس چیز سے ڈر جاتا تھا اسے خدا کا درجہ دیتا تھا۔اس غلط خدائی تصور نے پوجا پاٹ کے بے شمار مذاہب کو جنم دیا اور نوع انسان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔

نوحہ گر میں دور جہالت کے خدائی تصور کو چند مصروں میں یوں لکھا گیا ہے:

بے یقینی کے پہروں میں
فطرت کی بڑھتی ہوئی دشمنی کے جوانب میں بکھرے ہوئے
خوف کے آب و گل سے خدا کو بنایا[۳۴]

تمثیل میں شاعر اسلامی تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے خالق کی بات کرتا ہے۔

پرانے زمانے کے لوگوں کو بھی
ایک معبود کے ذکر کا حکم تھا
اور مجھے بھی[۳۵]

تصور وقت:

تصور کائنات میں وقت کی اہمیت اور عظمت وقت کے دو پہلوؤں کی وجہ سے قائم ہوتی ہے۔ وقت کا ایک تسلیم شدہ کردار یہ ہے کہ وہ نئی چیزوں کو جنم اور موت کے دائرے میں قید کر کے پیدا کرتا ہے۔ اس طرح جہاں وہ خالق کی طرح دکھائی دیتا ہے وہی قادر مطلق بھی نظر آتا ہے حالانکہ اس کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں اور یہ محض کائنات کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ کائنات تبدیلی مسلسل کے سفر میں ہے اور یہ سفر ہی ہمارے سامنے وقت کی شکل میں ابھرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر رشید امجد:

> ”وقت ایک سیل تند ہے جو ہمیں تنکوں کی طرح بہائے لیے جارہا ہے پھر آخر کار فنا کے سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ وہ ہر احساس سے عاری ہے۔ اس کا کام ہر شے کو برباد کر کے فنا کرنا ہے ہم اس کی گود میں پیدا ہوئے ہیں اور اس کے ہاتھوں ختم ہو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ ہم وقت کے دھاروں میں تنکے کی صورت بہے جارہے ہیں ایک ازلی و ابدی سمندر کی طرف، جو جائے مکمل فنا ہے یا بقا کی کوئی صورت۔“[۳۶]

ہم وقت کی ابد سے ازل کی دوری اور اس کی قرنوں، صدیوں، برسوں، منٹوں اور سکنڈوں کی یونٹ میں اس متحرک کائنات کی حرکت کی شکل میں ہی دیکھ سکتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز کائنات کی اس اندرونی تبدیلی کے عمل سے بندھی ہوئی ہے اور کائنات کے کسی بھی گوشے میں ہو رہی کوئی بھی حرکت چاہے اس کا محرک اشیا میں موجود خصوصیات ہوں یا انسانی ارادے سب وقت کا حصہ ہیں۔ زیر بحث نظموں میں تصور وقت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نوحہ گر میں شاعر تصور وقت کا ذکر کچھ اس طرح سے کرتا ہے

تم مجھے دیکھ سکتے نہیں

میں تمہیں دیکھتا ہوں

یہی وقت ہے[۳۷]

نظم تراش میں اختر عثمان زمان و مکاں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ

زماں و مکاں آج بھی اگر سن سکیں تو آواز آرہی ہے

اور اس کی خیر ابد کنار آدمی کے دل پر بجائے دف تھاپ دے رہی ہے[۳۸]

نظم تمثیل سے شعری اقتباس ملاحظہ ہو:

اگر تو گوارہ کرے تو
میں باب ابد پر ٹھہر کر
ازل کے دریچے میں ایک بار پھر جھانک لوں
اپنا رخت سفر باندھ لوں[۳۹]

انسان کی تخلیقات کا تذکرہ:

اردو ادب اور شاعری بہت چیدہ اور خوبصورت فن ہے۔ برصغیر کے شعراء کو اس فن میں کمال حاصل ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جب کسی چیز یا شعبے کی بات شروع ہوتی ہے تو مصنف یا شاعر اس پر مزید روشنی ڈالتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے۔ یہاں بھی تینوں نظموں میں شعراء نے بہت خوبصورت طریقے سے انسان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بات کو مزید بڑھاتے ہوئے انسانی تخلیقات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو انسان کی بڑائی بیان کرتی ہیں۔

صنوبر و سرو کی کتھائیں
وہ نکہتوں سے بھری ہوائیں نجانے کس اور جا چکی تھیں
متاع بحر اور گنج دریا خلیفتہ الارض کے خزانے میں جا چکے تھے[۴۰]

دنیائے فانی میں قدم رکھنے کے بعد انسان نے خوب ترقی کی روز بروز نئی ایجادات انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے گئیں اور اسے چاند تک رسائی مل گئی۔ تخلیقات کا ہجوم لگتا گیا اور آدمی نے اپنے ہنر اور قابلیت سے بہت سے معرکے سر کیے۔

کب تیرگی سے بھری کائناتوں میں کوئی کرن جگمگاتی ہے
کن فاصلوں سے دمادم کی آواز آتی ہے
میں تو ابھی چاند پر ہی قدم رکھ سکا ہوں[۴۱]

شہزاد نیر ایٹم بم جیسی خطرناک اور تباہ کن انسانی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیسے انسان ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اور تخلیقات کا ہجوم لگاتے ہوئے یہ بھول جاتا ہے کہ وہ جو بھی تخلیقات کر رہا ہے وہ انسان کو تباہی کی طرف لے جائیں گی

کیسے لفظ اور پہیے سے آغاز کر کے
دوپایہ خلا سے اجل پھینکنے لگ گیا(۴۲)

جنگ و جدل کی مخالفت:

معاشرے میں امن قائم رکھنے کے لیے بہت سی چیزوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے اور جنگ و جدل کے ہوتے ہوئے امن قائم نہیں ہو سکتا۔ زیر بحث نظمیں جنگ و جدل کی سخت مخالفت کرتی ہیں۔ نظم نگاروں کا کہنا ہے کہ جنگ و جدل بہت تباہی برپا کرتی ہے اس سے ہزاروں انسانی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے قتل و غارت کو چھوڑ دو۔

تصور موت:

دنیا میں بھیجے جانے والی ہر چیز کی ایک مدت مقرر ہے۔ جس کے بعد اس کی ہستی مٹ جاتی ہے اس لیے دنیا کو فانی کہا جاتا ہے کیونکہ ایک دن تمام دنیا ختم ہو جائے گی۔ نوحہ گر، تراش اور تمثیل میں موت کا تصور پایا جاتا ہے۔ موت ایک سچائی ہے۔ انسان کی زندگی کا ایک پل بھی بھروسہ نہیں۔ ہوا کا جھونکا آتا ہے اور انسان کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔ تمثیل میں خاور اعجاز آخری منظر نامے اور موت کی طرف اشارہ کرتے کہتے ہیں:

یہی راز تھا
جو کھلا مجھ پر
پہلی صف آرائی سے
غم کی گہرائی سے
جو مسرت ابھرتی ہے مرتی نہیں
موت زندہ بدن سے گزرتی نہیں(۴۳)

انسان بہت پہلے اس زمیں پر اتارا گیا تھا پھر اس نے رفتہ رفتہ ترقی کی، تجربات سے بہت کچھ سیکھا اور کرتے کرتے اپنے لیے خود ہی تباہی کا موجب بھی بن گیا ہے۔ انسانی ترقی کا منفی رخ، اس کے خطرناک ہتھیار اور دوسری کئی چیزیں ایجاد کر کے انسان نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔

بقول رشید امجد:

> "یہ موت یہ دکھ کیا ہے کیا زندگی ہی کا ایک طویل لمحہ ہے جس میں پل بھر کے لئے خوشی کا کوئی پرندہ چہکنے لگتا ہے لیکن کوئی صیاد اگلے ہی لمحے اسے اپنے جال میں پکڑ لے جاتا ہے۔ مجھے کئی بار احساس ہوتا ہے کہ موت میرے اندر ہی کہیں چھپی بیٹھی ہے ۔بس کسی دن ظاہر ہو جائے گی۔"(۴۴)

نوحہ گر میں شاعر ایٹم بم سے ہونے والی ہلاکتوں کا ذکر کرتے ہوئے موت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

موت چھتری سے بہتی ہوئی راکھ گرتی رہی(۴۵)

تراش میں زور کلام کے باوجود نظم پر سے ابہام کے پردے اٹھے نظر آتے ہیں۔ متکلم کی آواز سنجوگتا کو کچھ پیغام دینا چاہتی ہے۔ نظم نگار سات ارب لوگوں کے مرنے کی بات کرتا ہے جو جگہ جگہ مار کھا رہے ہیں اور عالم کاروں کا شکار ہونے پر مجبور ہیں۔

یہ سات ارب اپنی نارسائی پہ سرد سرد آہیں بھرنے والے
تمام ناکردہ کار تقدیر محض کی تہ میں مرنے والے(۴۶)

وجودیت:

انسان ہمیشہ سے اس الجھن میں ہے کہ وہ کون ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ انسان کا وجود بھی ایک فلسفہ ہے جس کے متعلق بہت سے نظریات موجود ہیں۔ یہ نہ صرف ایک فلسفہ بلکہ کائنات میں انسانی موجودگی کا اعلان ہے۔ وجودیت فلسفیانہ سطح پر اس فردی شعور کا نوحہ ہے جو مارسل کی ٹوٹی پھوٹی دنیا ڈی بوار کی کائنات لایعنی، مارلو یونٹی کی دنیائے منتشر میں اپنی جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ شاہین مفتی وجودیت کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"انسانی وجود کے معنی اور اہمیت کی بنیادی دریافت وجودیت کا جوہر ہے۔ جس کا سلسلہ
آزادی فکر و نظر کی نظریاتی کوششوں سے جوڑا جا سکتا ہے۔"(۴۷)

در حقیقت یہ ایک ایسا رویہ ہے جو انسانی دنیا میں عدم فیصلگی کی نشاندہی کرتا ہے اور وجود و لاوجود کے گرداب میں چکر کاٹتا ہے۔ کبھی انسان وجہ تلاش کرتا ہے، کبھی خدا کو آواز دیتا ہے، کبھی اپنی بقا چاہتا ہے، کبھی تاریخ کے اوراق الٹتا ہے، کبھی معرکے سر انجام دیتا ہے اور کبھی وہ اپنی ذات کے اثبات کی جڑ تلاش کرتا ہے۔ شاعروں نے انسان کے وجود میں آنے کے فلسفے کو بہت خوبصورتی سے اپنی نظموں میں بیان کیا گیا ہے۔ زیر بحث نظموں سے شعری اقتباس ملاحظہ ہوں:

میں تاج و تخت و کلاہ سے بے نیاز بھی ہوں
میں فرد مولا صفات بندہ نواز بھی ہوں(۴۸)
عالم بے وجودی سے نکلا تھا
رات و دن تو ابھی سو رہے تھے
جاگتا تھا تیرے بے در و بست حجروں میں(۴۹)
لاوجودی چٹانوں کے پھیلے ہوئے کالے پن میں
زمان و مکان سے لتھڑتے ہوئے(۵۰)

قربت باری تعالی:

انسان کو دنیا میں اللہ رب العزت نے اپنی عبادت کے لیے بھیجا ہے اور یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد جب اپنے پیدا کرنے والے یعنی اللہ تعالی کی عبادت کرنا ہے تو انسان کا باری تعالی سے رشتہ کس قربت کا ہے۔ تینوں نظموں میں انسان کے اپنے رب سے رشتے اور قربت کی بات کی گئی ہے۔ نوحہ گر میں یوں ذکر کیا گیا ہے:

لیکن اب میری باگوں کے نیچے میرا بخت ہے
آج انسان محبت محبت خدا ہے
دوانو محبت خدا۔۔۔(۵۱)

جب سے یہ دنیا بنی ہے اور لاکھوں لوگ دنیا میں آئے لیکن کوئی نہ کوئی کسک اور خواہش لے کر ہی اس دنیا میں گئے۔ تمثیل میں شاعر کا اشارہ انسان بالخصوص مسلمانوں کی طرف ہے جس نے خدا کے وعدے کی زنجیر کو مسلسل تھاما ہوا ہے اور ایک امید کے سہارے زندگی بسر کر رہا ہے۔ شاعر کے نزدیک مسلمان نے چودہ صدیوں سے اپنے پیغمبر کا فرمان اپنے ساتھ رکھا ہوا لیکن آج اور کل کے مناظر میں فرق تو نہیں لیکن اب معاشرے اور دنیا کی بے رغبتی سے اسے ایک اور چشمہ کی خواہش ہے جس کے پانی سے وہ سیراب ہو سکے۔ نظم تمثیل میں کردار واحد متکلم اپنے رب سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ اپنے رب سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور اس کو دیکھنا چاہتا ہے۔ واحد متکلم زمانے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

میرے ماتھے پہ بھی میرے سینے میں بھی
زندگی اور اس کے قرینے میں بھی
آسماں اور زمیں کے خزینے میں بھی
اے زمانے!
مرا ذکر کیوں[۵۲]

زیر بحث نظموں "تمثیل"، "تراش" اور "نوحہ گر" کا موضوع تاریخ انسانی ہونے کی وجہ سے ان میں کافی اشتراکات پائے گئے۔ مجموعی طور پر یہ نظمیں آغاز آفرینش سے لے کر اب تک کی تاریخ انسانی کا احاطہ کرتی ہیں لیکن شاعروں کا اس موضوع کو دیکھنے، بیان کرنے کا انداز اور پرکھنے کا زاویہ الگ الگ ہے۔ نظم نگاروں نے تاریخ انسانی، انسانی ارتقاء، قبل از آفرینش سے آغاز، انسان کا ظہور، نوحہ گری، قتل وغارت گری، تصور خدا، تصور زماں و مکاں، انسان کی تخلیقات کا تذکرہ کرتے ہوئے اختتامیہ امن کی خواہش پر کیا ہے۔ درحقیقت یہ نظمیں لاموجودیت سے موجودیت کی داستان بیان کرتی ہیں۔

حوالہ جات

1. توحید احمد، تقابلی ادب، ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جون، ۲۰۱۵ء، ص ۸
2. صادق علی گل، ڈاکٹر، سرگزشت تاریخ، پبلشرز ایمپوریم، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷
3. اختر عثمان، تراش، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۲۴
4. خاور اعجاز، تمثیل، شاخسار پبلیشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۴۴
5. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، الحمد پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۵
6. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۰
7. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۴
8. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۶۰
9. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۱۹
10. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۲
11. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۱۵
12. سورۃ الانبیا آیت نمبر ۳۰
13. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۰
14. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۱۷
15. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۵
16. ابو اعجاز حفیظ صدیقی، مرتبہ کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم ۱۹۸۵ء، ص ۸۶
17. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۱۷
18. ایضاً، ص ۶۳، ۶۲
19. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۴۰
20. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۴۳
21. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۱
22. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۱۶
23. ایضاً، ص ۳۳

24. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۶
25. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۳۵
26. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۳۱
27. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۴
28. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۵۸
29. Encyclopedia Americana , vol_4 _Groleir incorporated dictionary Connecticut , America 1982
30. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۰
31. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۵
32. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۶۲
33. عبداللہ، شاہین، توحید، رسالت اور ولایت، فائن پبلشرز، لاہور، س ن، ص ۲۰۰
34. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۵
35. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۲۷
36. صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۷۰
37. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۶
38. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۹
39. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۶۶، ۶۵
40. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۴
41. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۴۱
42. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۰
43. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۳۰
44. صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۳
45. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۳۵
46. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۸
47. شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸ء، ص ۱

48. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۳۴
49. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۴
50. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، ایضاً، ص ۱۲۰
51. ایضاً، ص ۱۳۹
52. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۳۱

باب چہارم:

تین معاصر طویل نظموں کے افتراقات کا جائزہ

"نوحہ گر"، "تراش" اور "تمثیل" میں جہاں اشتراکات پائے جاتے ہیں وہاں تینوں نظموں میں افتراقات بھی نظر آتے ہیں۔ جن کو درج ذیل نکات میں بیان کیا گیا ہے۔

سرمایہ درانہ نظام پر تنقید:

اختر عثمان بیسویں صدی عیسوی کے ترقی پسند شاعروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مارشل لاء کے خلاف بحالی جموریت کی تحریک میں عملی طور پر شریک رہے۔ اختر عثمان انٹرویو میں نظم کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

> "تراش بادشاہوں کی حکومت کی مذمت کرتی ہے اور سرمایہ داری نظام پر تنقید کرتی ہے۔ یہ دراصل lower class کو represent کرتی ہے۔ سماجی فرد کی بات کرتی ہے۔"(۱)

اختر عثمان نے اپنی نظم تراش میں زندگی کے متعدد قابل غور پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے سرمایہ درانہ نظام پر بھی تنقید کی ہے جو آج کے دور کا ایک بہت بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔ شاعر نے معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل اور عدم مساوات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ معاشرے میں امن قائم کرنے کے لیے مساوات ضروری ہے۔ یہ درس ہمیں دین کی تعلیمات سے بھی ملتا ہے اور یہی حوالہ انہوں نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> بہ پیش گرگان دہر بودم بر آمجوی چو گوسفندے، اسیر بندے
> بہ این ھمہ سر نہادہ بودم پی آن کہ شکر شکن، بہ قندے، عجب کمندے
> بہ باغ ہستی برای گوشان خوش سرودم بہ طور پندے، کلام چندے
> دہست بہ دشت فسانہ سر کن چو آہوئے میکند قندے، نگہ بلندے(۲)

مساوات کی اہمیت بتاتے ہوئے اختر عثمان نے نظم میں حضرت محمد کے آخری خطبے حجتہ الوداع کا حوالہ بھی دیا ہے۔ شاعر نے سرمایہ دارانہ نظام پر شدید تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ اس نظام نے کس طرح معاشرے سے مساوات کو ختم کر دیا ہے، غریب مزید غُربت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اور سرمایہ دار کا منافع اور بڑھتا جا رہا

ہے۔ محنت کش طبقہ محنت مزدوری کرنے کے بعد بھی اپنے حالات بہتر نہیں بنا سکتا جبکہ سرمایہ دار بادشاہت جیسے مزے کی زندگی گزار رہا ہے۔

یوسف حسن اختر رقمطراز ہیں:

> "اسے ترقی پسند سماجی فکر اور شعری فن دونوں کے جدید تقاضوں اور معیاروں سے بھی خاطر خواہ آگاہی حاصل ہے۔ اس کی طویل نظم تراش اس آگہی کے فکری و فنی سنجیدگی اور بالیدگی کے ساتھ تخلیقی اظہار کی ایسی مثال ہے جس میں بعض نکات کے اظہار میں اسے اردو کی ساری ترقی پسند جدید فکری اور فنی روایت میں اولیت کا اعزاز حاصل ہے۔ (۳)"

نظم تمثیل اور نوحہ گر میں نظم نگاروں نے ایسا کوئی نکتہ بیان نہیں کیا۔

کردار نگاری:

اگر کرداروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو شعراء نے تینوں نظموں میں فرضی کرداروں کو سامنے رکھ کر شاعری کا دائرہ باندھا گیا ہے۔ تراش میں دو کردار فنکار اور سنجوگتا، اسی طرح تمثیل میں بھی دو کردار واحد متکلم اور زمانہ جبکہ نوحہ گر میں صرف ایک کردار نوحہ گر کے گرد حصار باندھ کر شاعری رقم کی گئی ہے۔

نابودیت:

نابودیت وہ نظریہ ہے جس کے مطابق خلاء میں کچھ بھی موجود نہ ہونا ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے اس کائنات کی تخلیق کی اور انسان کو پیدا کیا مگر اس سے قبل ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ خلا میں صرف اللہ کی ذات اپنی وحدانیت کے ساتھ موجود تھی اس نہ ہونے سے ہونے کے نظریہ کو نابودیت کہتے ہیں اور جب یہ دنیا فنا ہو گی یعنی قیامت برپا ہو گی تو اس وقت پھر سے یہی سب دہرایا جائے گا اور تمام کائنات ختم ہو جائے گی۔ اللہ کی ذات اپنے جلال اور قدرت کے ساتھ اس نابودیت کے درمیان موجود ہو گی۔

نابودیت یا موت کے بعد مکمل فناپذیری کا نظریہ ایک ایسا تصور ہے جس کے مطابق غیر ایماندار ہمیشہ کے لیے جہنم کے اندر عذاب میں مبتلا نہیں رہیں گے بلکہ اس کی بجائے موت کے بعد وہ "مکمل فنا" ہو جائیں گے یعنی اُن کا جسم اور رُوح مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے اور نہ کسی کی عدالت ہو گی نہ ہی فردوس یا جہنم ہو گی۔

کیونکہ لوگوں کے لیے ابد تک جہنم میں رہنے کا تصور نہایت خوفناک ہے اس لیے نابودیت کا نظریہ بہت سے لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہے۔اب چونکہ بہت سے حوالہ جات نابودیت یا مکمل فنا پذیری کے اِس نظریے کے خلاف دلیل پیش کرتے ہیں۔ اِس لیے جب ہم اُس سب پر ایک گہری نظری ڈالتے ہیں جو بائبل شریر کے انجام کے بارے میں کہتی ہے تو اُس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ گناہگاروں کے لیے جہنم کے اندر سزا ابدی نوعیت کی ہو گی۔ نابودیت کے اِس نظریے پر یقین رکھنا در اصل بائبل میں پائے جانے والے درج ذیل ایک یا ایک سے زیادہ عقائد کے بارے میں غلط فہمی کا نتیجہ ہے جن میں گناہ کا انجام، خدا کا انصاف اور جہنم کی نوعیت شامل ہیں۔ جہنم کی نوعیت کے لحاظ سے نابودیت کے نظریے کو ماننے والے آگ کی جھیل کے مفہوم کو غلط سمجھتے ہیں۔ یقیناً اگر کسی انسان کو خولتے، ابلتے لاوے کی جھیل میں ڈالا جائے تو وہ قریباً فوراً ہی ختم ہو جائے گا۔ تاہم آگ کی جھیل کو مادی اور رُوحانی دونوں حوالوں سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ محض انسان کا بدن ہی نہیں جسے آگ کی جھیل میں ڈالا جائے گا بلکہ انسانی بدن کے ساتھ ساتھ اُس کی جان اور رُوح کو بھی اُس میں ڈالا جائے گا۔ رُوحانی نوعیت مادی آگ سے ختم نہیں ہو سکتی۔ ایسا لگتا ہے کہ غیر نجات یافتہ لوگوں کو ابدیت کے لیے ایک خاص بدن مہیا کیا جائے جیسے نجات یافتہ ایمانداروں کو نیا جلالی بدن عطا کیا جائے گا۔ اِن بدنوں کو ابدی مقامات پر زندگیاں گزارنے کے لیے تیار کیا جائے گا۔ نظریہ نابودیت کے ماننے والوں کی طرف سے جہنم کی ہمیشگی کے بارے میں ایک اور اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ایک محدود وقت کے گناہوں کے لیے غیر ایمانداروں کو خدا کی طرف سے ہمیشہ کے لیے عذاب میں ڈالنا ناانصافی ہو گی۔ یہ خدا کے لیے انصاف کی بات کیسے ہو سکتی ہے کہ ایک شخص جس نے ستر سالہ گناہ آلودہ زندگی گزاری ہو خدا اُسے ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا کر دے ؟اِس کا جواب یہ ہے چونکہ ہم ابدی خدا کے خلاف گناہ کرتے ہیں لہذا ہمارے گناہ کے نتائج بھی ابدی ہی ہوں گے۔

تمثیل اور نوحہ گر میں اس نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے نظم نگاروں نے چند حوالے دیے ہیں۔

گھومتی، جھومتی، گرم ٹکڑوں میں بٹتی ہوئی
دیکھتا تھا۔۔۔ نہونے سے ہونا
خلا سے فضا
"کچھ نہیں" سے "بہت کچھ" اچھلتے ہوئے
اک دھوئیں سے فلک کو نکلتے ہوئے![۴]

جہنم کا وجود ہی شاید اِس بات کی بنیادی وجہ ہے کہ خدا نے ہمارے گناہ کی قیمت چکانے کے لیے یسوع کو بھیجا تھا تا کہ ہم اُس کے وسیلے سے نجات پا کر جہنم سے بچ سکیں۔ موت کے بعد "مکمل طور پر نابود" ہو جانا خوفناک انجام نہیں ہے مگر ہمیشہ کے لیے جہنم کے عذاب میں رہنا واقعی سب سے بھیانک انجام ضرور ہو سکتا ہے۔ ہمارے گناہ کے لامحدود قرض کے لیے یسوع کی موت لامحدود موت تھی تا کہ ہمیں ابد تک اِس قرض کو جہنم میں ادا نہ کرنا پڑے۔ جب ہم یسوع مسیح پر ایمان لاتے ہیں تو ہمارے ساتھ نجات، معافی، پاکیزگی اور فردوس میں ابدی مقام کا وعدہ کئے جاتا ہے۔ اگر ہم خدا کی طرف سے ملنے والے ابدی زندگی کے تحفے کو مسترد کرتے ہیں تو ہمیں اِس فیصلے کے ابدی نتائج کا سامنا بھی کرنا ہو گا۔

خاور اعجاز آخری زمانے یعنی قیامت کی بات کرتے ہیں جب سب کچھ فنا ہو جائے گا اور اللہ کی ذات باقی رہے گی۔ تصور موت کے حوالے سے شعری اقتباس ملاحظہ ہو:

بچھڑ جانے والوں کی یادیں ہی زندہ ہیں
چہرے نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں
سلگتی ہوئی نیند باقی ہے
آنکھیں نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں
تھکن جسم کی قبر میں سو گئی ہے
سفر ختم ہونے کو ہے
اور منزل نظر آ رہی ہے۔۔
اگر ایک لمحہ مجھے مل سکے
اب سمے ہی کہاں ہے
کہ تصویر ہونے کو ہے سارا منظر
سفر ختم ہوتا ہے[۵]

تخلیق کائنات:

تخلیق کائنات کے بارے میں بہت سے نظریات اور تحقیقات موجود ہیں۔ تمام تر تخلیق کرنے والی ذات اللہ تعالی کی ہے مسلمان اس بات پر پختہ یقین اور ایمان رکھتے ہیں لیکن غیر مذہب اپنی منطق اور سائنسی

دلائل دیتے ہیں جو در حقیقت اللہ کی وحدانیت کا ہی ثبوت ہے۔ زیر بحث نظموں میں بھی تینوں شعراء نے تخلیق کائنات کے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ پروفیسر سیف اللہ خالد کے خیال میں "ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کائنات سے ہم آہنگی ہمارے شعری مستقبل کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔"(۶) تخلیق کائنات کے متعلق تراش میں اسلامی حوالہ ملتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

نجانے وہ کون سی سمسائیں ہیں جو اک ساتھ پاپ پن گن اگن رہی ہیں!
۔۔۔۔وہ کہہ رہی ہیں کہ ساری بپتائیں ساری آشائیں لطمہ لفظ کن رہی ہیں(۷)

نظم تمثیل میں تخلیق کائنات کا اسلامی حوالہ اور سائنسی حوالہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح نوحہ گر میں ان دونوں حوالوں کے علاوہ یونانیوں کی تھیوری کا حوالہ بھی ملتا ہے۔

کسی نے بہت دور برقی بٹن کو دبایا

دھماکہ ہوا(۸)

میں وہیں تھا
جہاں بے پکڑ سے قلم جب ہلا
تو وہ تختی تھی کسی تخت پر تھی(۹)

اسلوب اور ڈکشن میں فرق:

اسلوب انگریزی لفظ سٹائل کے مترادف ہے۔ اسلوب ایک بات کو دوسری بات سے مختلف کرنے کا نام ہے۔ اردو میں زبان و بیان، انداز بیاں، طرز تحریر اور رنگ سخن جیسی اصطلاحات اسلوب کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ اسلوب کے لغوی معنی ڈھنگ، انداز اور روش کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں اس سے مراد کسی تخلیق کار کا وہ طرز نگارش ہے جو اسے کسی مخصوص صنف ادب میں دوسرے تخلیق کاروں سے منفرد بناتا ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اسلوب کے ضمن میں تحریر ہے کہ:

"اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ ادائے مطلب یا خیالات، جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتاد طبع، فلسفہ حیات اور

طرزِ فکر و احساس جیسے عوامل مل کر حصہ لیتے ہیں۔اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے۔"(۱۰)

اسلوب ایک ادیب کی مسلسل ریاضت ہے۔ جس سے اس کی ذات کا حسن ،اس کی مخصوص لفظیات، محاورات اور موضوع کے ساتھ وابستگی اور پھر اس کا بار بار استعمال ایک ایسی طرز کو جنم دیتا ہے۔جو اس ادیب سے مخصوص ہو جاتی ہے۔ڈکشن لفظیات کو کہتے ہیں۔ تحریر میں لفظیات کی بہت اہمیت ہے۔ مولانا شبلی نعمانی رقمطراز ہیں:

"لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے۔دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کمزور ہو گا تو وہ بھی کمزور ہو گی۔ پس اگر معنی میں نقص نہ ہو اور لفظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائے گا۔"(۱۱)

زیر بحث نظموں میں تینوں نظم نگاروں نے اسلوب اور ڈکشن میں بڑی ہنر مندی سے کام لیا ہے۔ نظم تراش کا جائزہ لیا جائے تو اس میں اختر عثمان کا اسلوب روایتی اور قدیم طرز کا ہے۔۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء میں جس طرح بات کی جاتی تھی بھاری اور مشکل تراکیب کا استعمال کیا جاتا تھا وہی انداز ان کے اسلوب میں ملتا ہے۔یوسف حسن تراش کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"نظم کی زبان مجموعی طور پر فارسی آمیز ہے مگر اس سے ہمارے ہکاری آوازوں والے اسماء اور افعال اس سے ایسے ہم آہنگ ہو کر آئے ہیں کہیں کوئی دھچکا محسوس نہیں ہوتا۔"(۱۲)

ڈکشن کے حوالے سے دیکھا جائے تو اختر عثمان نے اپنی نظم میں عربی اور فارسی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

یہ بوق و طوق و دہل، جلاجل سلاسل و تیغ کی صداوں کو اپنی تاریخ مانتے ہیں۔(۱۳)

نظم تمثیل کا جائزہ لیا جائے تو اس میں خاور اعجاز کا اسلوب سادہ، عام، سہل، روزمرہ اور آسان طرز کا ہے۔ جس طرح روزمرہ بات اور گفتگو میں الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہی انداز ان کا ہے۔ انہوں نے نظم میں تراکیب کا استعمال کیا ہے لیکن یہ تراکیب اختر عثمان کی استعمال شدہ تراکیب کی طرح مشکل اور پیچیدہ نہیں

ہیں۔ڈکشن کے حوالے سے دیکھا جائے تو خاور اعجاز نے اپنی نظم میں ہندی، انگریزی اور فارسی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

مری منتظر آنکھ کا چوکھٹا
اور اس میں جھلکتی ہوئی
تیری تصویر کا ایک رخ
جس کا کیپشن فرشتے لکھیں گے (۱۴)

نظم نوحہ گر کا جائزہ لیا جائے تو اس میں شہزاد نیئر کا اسلوب جدید طرز کا ہے۔ ڈکشن کے حوالے سے بات کی جائے تو تینوں نظم نگاروں نے مختلف لفظیات کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ تینوں کا فنی شعور پوری طرح آشکار ہوتا ہے۔ شہزاد نیئر نے بھی الفاظ کو مناسبت سے استعمال کرتے ہوئے جملوں میں نکھار پیدا کیا ہے۔ شہزاد نیئر انٹرویو میں بتاتے ہیں کہ:

"مجھے لفظوں سے بہت پیار ہے۔ لفظوں پر توجہ دیتا ہوں چاہے وہ کسی بھی زبان کے ہوں اگر مجھے جانچنا پرکھنا ہے تو لفظوں سے سوال جواب کرو۔" (۱۵)

لفظ مشائی کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا تخلیق شدہ لفظ ہے اور کتنے بڑے مضمون کو صرف ایک لفظ میں سمو کر وجود نظم کا حصہ بنایا گیا ہے۔ مشائی لفظ خاص ارسطو کی ذات سے منسوب ہے۔ اسی طرح ابلق سیخ پا، مفردوں کا تنوع، کم وجودی کا پیکر، بے پکڑ سے قلم ہلا، غبارے کی نشو ونما، پتھر میں درانتی کو دیکھا گیا، قلہ کوہ کے سنگ بستہ بدن، مادے کی تجسیم اور دشت تاریخ غرض یہ کہ ایسی کئی مثالیں ہیں جہاں شہزاد نیئر نے اختراع کو عبور بھی کیا اور قاری تک نہایت سادگی اور مرصع کاری سے اپنی بسیت قلمی اور ہنر کے بل بوتے پر پیوست سطر بھی کیا۔ جلیل عالی ان کی نظموں کے بارے میں رائے دیتے ہیں کہ: "شہزاد نیئر کی نظموں کی شعری جاذبیت میں صوتی التزامات کا استعمال ایک اہم عصر کی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔" (۱۶) شہزاد نیئر نے نوحہ گر میں ہندی اور فارسی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ کئی نئی لفظیات بھی بنائے جیسے سنگیائے اور مشائی وغیرہ

سطح ارضی کی چھوٹی سی پٹی میں بندھ کر
یہیں سنگیائے پڑے ہیں (۱۷)

مورخین پر تنقید:

مورخین انسانی ماضی کا ایک خاص حصہ ہیں۔ جن کے لکھے ہوئے حرف نئی نسل کو اپنے آباؤ اجداد کی روداد کو پڑھنے اور بہتر طریقے سے سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اتنا اہم مقام رکھنے والے تاریخ نگار اگر اپنے کام میں ملاوٹ کریں اور حقیقت کو توڑ مروڑ کر بیان کریں تو انسانی تاریخ کی حقیقت نئی نسل تک کبھی نہیں پہنچے گی۔ یہی وجہ ہے کہ نظم تراش میں اختر عثمان نے جھوٹے تاریخ نگاروں پر تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ کچھ مورخین بھی دو وقت کی روٹی کمانے کی خاطر اپنے کام سے بغاوت کرتے ہوئے جھوٹ لکھا کرتے تھے۔

یہ اپنے کاذب خدا پہ قربان ہونے والے شکست خوردہ دروغ گو بے حیا مورخ[۱۸]

شاعر تاریخ کو اس لیے پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ عوام کی مرضی سے نہیں لکھی گئی۔ نظم نگار کہتا ہے کہ جس کو اپنا مددگار جانا اس نے ہی ہمارے ساتھ برا کیا وہ ہی ہمارے راستے زر رساں بن کر آیا۔ سرمایہ داری نے انسان کو آقا و غلام یعنی اونچے اور نچلے طبقے میں تقسیم کر دیا۔ اگر ان لوگوں کو ہوش آجائے تو وہ سات ارب لوگ اپنا حق چھین لیں گے۔

یہ پنچھیوں کے گرسنہ غول اور حسیں خونیں خبیث بندے سیاہ دھندے
سواد گلشن کے چار جانب لگے ہوئے خاردار پھندے مہیب دندے[۱۹]

مختلف مذاہب کا تذکرہ:

اللہ تعالی نے انسان کو دنیا میں اپنی عبادت کے لیے بھیجا تاکہ انسان اللہ تعالی کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر ادا کرے اور اس کی عبادت کرے مگر انسان نے کھلے دشمن ابلیس کے وار کی زد میں آکر اپنی حیات کے اصل مقصد کو بھلا دیا اور اپنے لئے نئے خدا ڈھونڈنے اور بنانے لگا۔ تینوں نظموں میں انسان کے اپنے چنے گئے اور اللہ تعالی کے بتائے ہوئے مذہب یعنی دین اسلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ نظم تمثیل میں مذہب اسلام کا ذکر موجود ہے جبکہ تراش میں اسلام اور ہندو مذاہب دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح نوحہ گر میں بھی اسلام ہندو مذہب اور بدھ مت کا ذکر کیا گیا ہے۔

وہ سدھارتھ کے پالے ہوئے

شانتی حرف کاسے میں ڈالے ہوئے
راستے میں برہما کی تلوار سے آسماں پا گئے[۲۰]

تھیوریز کا تذکرہ:

تھیوریز یعنی نظریات کا تذکرہ عام طور پر کسی بات کو سمجھانے یا اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ زیر بحث نظموں میں شعراء نے مختلف تھیوریز کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ خاور اعجاز نے تمثیل میں کائنات کی ابتداء کے لیے بگ بینگ تھیوری کا ذکر کیا۔ اسی طرح شہزاد نیئر نے تخلیق کائنات کے حوالے سے بگ بینگ تھیوری، سٹیفن ہاکنگ تھیوری اور یونانی تھیوری کو نظم میں حوالے کے طور پر پیش کیا اور انسانی ارتقاء کے لیے ڈائناسور تھیوری کو موضوع بنایا ہے۔

سمت آشنا غیر مادے کا ٹکراؤ
نقطے کا پھیلاو ہونے میں بدلا
تو کچھ وقت تھا۔۔۔کچھ جگہ[۲۱]
یہیں آتش ذرہ باری ہوئی
حادثاتی جدائی کا غصہ تپ جاودانی میں رلا
تو سوز نہائی کمائی ہوئی
آگ پانی میں پہلی جدائی ہوئی[۲۲]

تراش میں اختر عثمان نے کارل مارکس کی تھیوری کو بنیاد بنا کر سرمایہ دارانہ نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ انسان طبقاتی جدوجہد میں جکڑا ہوا ہے اور اس کو آزادی کا احساس نہیں ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ غریب انسان پیٹ کی لپیٹ میں ہے صرف پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے تمام فعال سرانجام دیتا ہے۔ یہ تفریق پیدا کرنا بھی انسان نے خود ہی ایجاد کیا ہے کیونکہ وہ آزادی کی قیمت نہیں جانتے اور صرف دو وقت کی روٹی کے لیے آقا کی خدمت بجالاتے ہیں۔ شاعر کے مطابق نظام تفریق انسانوں نے بنایا ہوا ہے اور غریب انسانوں نے خود محنت کر کے پیسہ امیروں کے ہاتھ میں دیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ مار دھاڑ سے شروع ہو کر زنجیروں پر ختم ہوتی ہے۔ جب انسان نے ترقی کی تو پہلے ریاست بنائی پھر حکمران بنائے اور ان حکمرانوں کی ہر طرح سے خدمت بجالائے۔ یہ اپنے آقاوں کے سوا کسی کی بات نہیں مانتے تھے۔ انسان تقدیر کے ہاتھوں مجبور کبھی خدا

پر الزام دھرتے تو کبھی خاموش ہو جاتے گویا طرح طرح کے لوگ آباد تھے۔ اختر عثمان کہتے ہیں کہ حکمرانوں کے حصار میں غریب لوگوں کو آزادی کی قیمت کا پتہ چل جائے تو وہ کافی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اب ٹیکنالوجی بہت آگے جا چکی ہے یہ ابھی بھی غافل اور بے خبر ہیں۔

غلام و آقا کے خط میں تقسیم ہو کے الجھے ہوئے کھلونے
جو خیر و شر کے سیاہ روشن کو اوپری دل سے مانتے ہیں۔۔۔
یہ ایسے تاریخ زاد ہیں جو نظام تفریق میں سر فروش چیختے ہیں(۲۳)

تصور زمان و مکاں:

تینوں نظموں میں اشتراقی طور پر زمان و مکاں کا نظریہ پیش کیا گیا ہے لیکن تمثیل میں زمانے کو استمرار اور ادوار میں تقسیم کر کے زمانے کی اہمیت کو تفصیل سے اجاگر کیا ہے۔ بقیہ دو نظموں میں یہ تقسیم نہیں کی گئی جس کی وجہ سے یہ باقی نظموں سے مختلف نظریہ پیش کرتی ہے۔ خاور اعجاز نے نظم کو سات زمانوں میں یا سات ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ یہ ابتدائے آفرینش کو بنیاد بناتی ہوئی وقت اور فاصلے طے کرتی ہوئی نہ صرف چھ زمانوں کے ان گنت نوری سالوں کے عرصے طے کرتی ہے بلکہ ساتویں زمانے کی خبر رسانی بھی کرتی ہے۔ خاور اعجاز زمانے سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

اے زمانے
ترے وقت ساگر میں
آبی پرندوں کی صورت
نمی اور مٹی میں رہتا تھا(۲۴)

بقول سیتہ پال آنند:

"زمانہ کا تصور جہاں استمرار سے ہے وہاں ادوار سے بھی ہے۔ ان ادوار کو بقدر بیانیہ یوما فوما مرور یا سیل زمانہ کے پیمانے سے ماپ کر تقسیم نہیں کیا جا سکتا لیکن ذہنی سطح پر بے شمار کا شمار یہ تیار کرتے ہوئے ارتقا کے پیمانے سے ماپنا (اور صرف صنف نظم میں) شاید ممکن ہے۔ یہ کام شاعر نے اس نظم میں کمال چابکدستی سے کیا ہے۔"(۲۵)

زمانہ یا وقت ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت سے تحقیقات و تحریریں موجود ہے اور اسلامی نظریات سے دیکھا جائے تو وقت کا دوسرا نام خدا یعنی اللہ کی ذات کو سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور دنیائے فانی میں ہر چیز وقت کے آگے بے بس ہے۔ ہر چیز اس کے تابع نظر آتی ہے۔ شاعر زمانے کی اہمیت اجاگر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زمانے کو یہ قوت حاصل ہے کہ وہ ہر چیز پر چھاپ چھوڑ دیتا ہے۔ زمانے کو ثبات ہے۔ زمانہ اور وقت ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ زمانہ کبھی ایک حالت میں نہیں رہتا۔ جب انسان گزرے ہوئے زمانے کا سوچتا ہے تو اسے تاریخ انسانی کے کئی واقعات آنکھوں کے آگے پھر جاتے ہیں۔ یہی کمال فنکاری ہے کہ شاعر نے زمانے کو تجسیم کیا اور اس سے مکالمہ کرتا نظر آتا ہے۔

اے زمانے!
یہ میں جو ترے گنبدوں کی طرف دیکھتا ہوں
نگاہوں میں صدیوں کی اک آشنائی کی لو کو لیے[۲۶]

نظریہ مخویت:

نظریہ مخویت سے مراد خیر و شر کا نظریہ ہے۔ انسان کو دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجنے کے بعد اللہ نے انسان کی رہنمائی کے لیے منتخب کردہ پیغمبر، رسول اور صحیفے اور آسمانی کتابیں نازل کیں تاکہ انسان کو دنیا میں خیر و شر کی پہچان ہو سکے اور وہ زندگی گزارنے کے لئے دونوں میں سے ایک راہ چنے۔ انسان کے اندر خیر و شر دونوں کے اجزا موجود ہیں اب یہ انسان کا اپنا انتخاب ہے کہ وہ اپنے اندر موجود نیکی اور بدی کی طاقت میں سے کسے چنتا ہے اور پروان چڑھاتا ہے۔ مذہبی حوالوں کے ساتھ نظریہ مخویت کا ذکر زیر موضوع نظم تراش اور تمثیل میں ملتا ہے۔

وہ دائمی دھڑکنوں کا مثردہ
جہاں عمل اور نیتیں ایک صدائے خیر العمل
جسے سن کے بھائی بھائی کی دھن بقایاب ہو گئی ہے[۲۷]
دل ناتواں کو
الوہی محبت کا پیغام پہنچا۔۔
حکم آنے لگے

آدمی کو قوانین قدرت

سزا اور جزا کے قرینے بتانے لگے (۲۸)

عالمی ادب کا حوالہ:

عالمی سطح پر علم و ادب کے وسیع خزانے موجود ہیں جو زیادہ تر مسلمان ادیب، شاعر، فنکار نئی نسل کی آسانی اور رہنمائی کے لیے ذخیرہ کر گئے ہیں۔ اختر عثمان نے اپنی نظم تراش میں عالمی ادب کی بات کرتے ہوئے ارسطو، ابن سینا، ابن رشد، ارشمیدس، سٹائن، حافظ، میر، مانی، اینجلو، روم، خیام، انیس اور فردوس جیسی عالمی شہرت یافتہ شخصیات کا ذکر کیا ہے کہ یہ انسانوں کی بھلائی، نیکی اور رہنمائی کا کام کرنے والے ادیب کہاں گئے ہیں۔ میں ان کے لفظوں کی مشعلوں میں اپنا مستقبل روشن دیکھتا ہوں۔ ان کے الفاظ امید کی کرن دکھاتے ہیں، ان کا کلام ہمارے لیے اثاثہ ہے گویا انہوں نے ہر زمانے کو سیر اب کیا۔ یہ حوالہ صرف تراش میں ملتا ہے بقیہ دو نظموں میں حوالہ نہیں ملتا۔ تراش سے شعری اقتباس ملاحظہ ہو:

یہ مانی و اینجلو کی سنگت میں روم و خیام کے ترانے

انیس و فردوسی اور ہومر کے بوق و قرنا۔۔

آج تک سب یہاں حسن بانٹتے ہیں۔۔

ہر آنکھ میں دیپ بھرنے والے (۲۹)

مختلف حوالہ جات کا استعمال:

جو نظمیں زیر بحث ہیں ان تینوں میں مرکزی کردار انسان کا ہے اور ان میں انسانی روداد کو مختلف حوالہ جات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تراش میں ادبی، اسلامی اور تاریخی حوالہ جات دیئے گئے ہیں مثلاً اہرام مصر، خطبہ حجتہ الوداع، حضرت آدم کا قتل، عظیم شخصیات کا حوالہ، کارل مارکس کا نظریہ، حضرت حوا وغیرہ،، نوحہ گر میں اسلامی، سائنسی اور تاریخی حوالہ جات کا ذکر زیادہ ملتا ہے مثلاً روئے زمین پر انسان کا پہلا قتل، واقعہ کربلا، تھیوریز کا تذکرہ، طوفان نوح، بائبل کا حوالہ، بنی اسرائیل اور ارسطو کا تاریخی حوالہ وغیرہ۔ اسی طرح نظم تمثیل میں تاریخی، سائنسی حوالہ جات کے ساتھ مذہبی حوالہ جات کا تذکرہ زیادہ نظر آتا ہے مثلاً تھیوریز کا ذکر ، حضرت آدم ، قیامت کی طرف اشارہ ، پہلی وحی ، خانہ کعبہ کا قیام ، حضرت نوح، بنی اسرائیل ، صحیفے ، کوہ طور، الہامی کتابیں کا نزول اور واقعہ کربلا وغیرہ۔ نظم نگاروں نے انسان کا اس کی پیدائش سے پہلے خلا میں

موجودگی کا بھی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالی نے انسان کی روح پہلے پیدا کی اور بعد میں اس کو جسد خاکی میں منتقل کیا۔ تراش میں انسانی روح کی خلا میں موجودگی کا ذکر نہیں ملتا جبکہ باقی دونوں میں بحث موجود ہے۔

مذہبی تعلیمات کا تذکرہ:

دین اسلام تمام انسانیت کے لیے رہنمائی اور امن والا دین ہے اور قرآن پاک کی آیات اور رسول پاک کی تعلیمات کی شمع ہر مسلک سے تعلق رکھنے والے کے لیے مشعل راہ ہیں۔ خطبہ حجتہ الوداع میں اللہ کے رسول نے معاشرے میں پھیلنے والے بگاڑ سے متعلق جو باتیں بتائیں ہیں ان میں سے ایک یہ کہ کسی گورے کو کالے پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں تم میں سے اللہ کے نزدیک اسی کو فضیلت حاصل ہے جو پرہیز گار ہے۔ مساوات ایک ایسا جُز ہے جو انسان کے اندر غرور پیدا نہیں ہونے دیتا۔ انسانی مساوات ویسے تو بہت طویل بحث کا حامی نُقطہ ہے مگر شاعر اختر عثمان تفرقہ ختم کرنے کی بنیاد بتا رہا ہے کہ چاہے تم جو بھی ہو جیسے بھی ہو تم میں اور باقی انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے تم سب اللہ کے سامنے برابر ہو اور اگر برتری دی بھی گئی ہے تو اُسکی بنیاد تقویٰ ہے نہ کہ دُنیاوی چیزیں۔ شاعر کہتا ہے کہ جو مساوات کا دَرس تمہیں دیا گیا اسکی صدائیں اب بھی گونجتی ہیں۔ خطبہ حجتہ الوداع میں بیان کیے جانے والے موتی حضرت عثمان نے اپنی نظم تراش میں بیان کیے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

زماں مکاں میں بس ایک آواز ہر سمت میں گونجتی تھی
تم ایک ہو سب
سیہ، سفید ایک ہیں[۲۹]

تمثیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت حواء، حضرت آدم، تصور توحید، تصور خالق، آسمانی کتابوں کے نزول، صحیفے اور پہلی وحی کا نزول جیسے مذہبی واقعات اور مذہبی تعلیمات کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے جبکہ نوحہ گر میں مذہبی تعلیمات کے متعلق بحث نہیں کی گئی۔ تخلیق آدم کی پیدائش کے بعد اس کی جسمانی اور روحانی ضرورت کا سامان بھی مہیا کیا۔ اللہ نے انسان کی روحانی ضروریات کے لیے انبیا کو بھیجا۔ ہر قوم کی طرف نبی بھیجے جو لوگوں کو توحید اور عبادت الٰہی کی تعلیمات دیتے رہے۔ اللہ تعالی نے گزشتہ زمانے میں مختلف قوموں کی ہدایت کے لئے صحیفے بھی نازل کیے۔ یہ چھوٹی کتابیں یا ورق اللہ تعالی نے قرآن شریف سے پہلے نازل کیے جن میں انسانوں کے لیے مفید نصیحتیں اور کارآمد باتیں ہوتی تھیں۔ خاور اعجاز نے اس کا حوالہ یوں دیا ہے:

تحائف تیرے مجھ کو ملتے رہے تھے

مسرت کی کونپل بہت کم کھلی تھی
وہ خوشبو
جو میرے سرہانے پڑی تھی(۳۱)

ابتدائے آفرینش سے انسان کا اصلی مذہب توحید یعنی اسلام تھا۔ بعد میں جب لوگ عقیدہ توحید سے منحرف ہو گئے تو لوگوں کی اصلاح کے لیے قاصد بھیجے جو اسلام کی تعلیمات اور توحید کا درس دیتے رہے۔

حمد ٹھہری تیری ابتدا
ایلچی لے کے فرمان آنے لگا
آدمی اپنے معبود کے روبرو سر جھکانے لگا(۳۲)

انسانی خواہشات کا تذکرہ:

انسان مٹی کا پتلا سہی مگر اس کی خواہشات پر کوئی روک نہیں اور وہ بہتر سے بہتر زندگی کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ انسان نے خواہشات کے لیے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے قتل وغارت کی اور مزید سے مزید پانے کی لگن میں تباہی مچادی۔ خواہشات ہی انسان کو اس کی زندگی کے مقصد سے بھٹکاتی ہیں اور ان غیر ضروری خواہشات کا تذکرہ تمثیل میں موجود ہے۔ واحد متکلم ان گنت خواہشات رکھتا ہے۔ یہ کبھی خدا سے ملنے کا خواہشمند تو کبھی آنے والے زمانے کا منتظر ہے۔

آسمانوں پہ پھیلی ہوئی
کہکشاؤں پہ نظریں جمائے ہوئے
ساعت دید کا منتظر ہوں(۳۳)

فرد مولا صفات:

انسان کی عظمت و بڑائی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اسے دین اسلام کا تحفہ عطا کیا گیا اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، شعور دیا، عقل دی اور دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا۔ یہ تمام باتیں انسان کی عظمت بیان کرنے کے لیے بہت معنی رکھتی ہیں۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ انسان کا وجود خود اللہ کی وحدانیت کی ایک واضح دلیل ہے اور انسان کو اللہ رب العزت نے مولائی صفات بھی عطا کی ہیں۔ انسان کو اچھے اور برے کا فرق معلوم ہونا، عقل اور سوچ عطا ہونا، خدا کا نائب بنایا جانا، زمانے کے راز ڈھونڈنا، ستارے دیکھ کر حال بتانا

اور دوسروں کی مدد کرنا تمام وہ صفات ہیں جو انسان میں موجود ہیں اور ان تمام کا تذکرہ صرف تراش میں موجود ہے۔

میں سینہ خاک میں خفی ایک راز بھی ہوں
تہ فلک میں ہی زیستن کا جواز بھی ہوں
میں دور تیرہ شبی میں اک نجم ساز بھی ہوں (۳۴)

شاعر انسانی تاریخ کے تمام ادوار کو تھورا تھوڑا اشار تا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان کے ہزاروں روپ ہیں اور ہزاروں رنگ اس نے اختیار کیے ہیں کبھی وہ دشت حجاز میں سسکیاں بھرتا ہے اور کبھی آسماں کا باسی ہوا کرتا تھا۔ اب اسے زمیں پر اتار کر ایک راز بنا دیا گیا ہے اور اس کے ذریعے بزم میں ہنگامہ ہے۔ چھٹے کینٹوز میں واحد متکلم اپنا رجز گاتا ہے اور ساتھ ہی خود اس کا جواز بھی پیش کرتا ہے۔ شاعر انسان کی ازلی صورتوں پر، انسان پر گزرے ظلم و ستم اور اس کے غرور تکبر کا ذکر کرتا ہے۔

یہاں پہ کچھ بھی نہیں تھا میرے جنوں سے پہلے
نہاد کب تھی بھلا دل بے ستوں سے پہلے۔۔
میں عین اصل جہاں، کہاں اور کیوں سے پہلے (۳۵)

بقیہ دو نظموں میں نظم نگاروں نے فرد مولا کی صفات کو شامل نہیں کیا گیا۔

موقف:

زیر بحث نظمیں تمثیل، تراش اور نوحہ گر ایک ہی موضوع کو بیان کرتی ہیں لیکن ان کا موقف جدا ہے۔ نظموں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اختر عثمان نے اپنے مواد موضوع کو جس آئڈیالوجیکل موقف سے پیش کیا ہے وہ ترقی پسندوں کا معروف آفاقی موقف ہے۔ اس موقف کا خلاصہ اس نے دو الگ الگ کینٹوز میں بیان کیا ہے۔ ایک کینٹو میں اجتماعی خواب ہیں اور دوسرے میں واحد متکلم نوع انسانی کے ترجمان کی حیثیت سے اپنا اثبات کرتا ہے۔ خاور اعجاز نے تمثیل کو اسلامی تہذیبی نظریے کے تحت لکھی گئی۔ شہزاد نیئر کی نظم انسانی تاریخ کے آغاز بلکہ کائنات کی ابتداء سے لے کر حال تک آتی ہے اس میں ایک ہی موضوع ہے انسان کبھی خدا کے نام پر، کبھی پیسے کے نام پر، کبھی انا کے نام پر، کبھی ہوس ملک گیری کا نام پر انسانوں کا قتل کرتا رہا ہے۔ اگر انسان اسی طرح انسانوں کو قتل کرتا رہا تو پھر نسل انسانی کی بقا کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

اختتامیہ میں فرق:

زیر بحث نظموں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اختتام میں فرق پایا جاتا ہے۔ نظم تراش کے اختتام پر واحد متکلم کا تراشا ہوا نسائی بت جو پوری انسانیت کی علامت ہے مجرد سے سماجی فرد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نظم بننے کا تخلیقی پروسیس نئے جہاں کی تخلیق کا بھی استعارہ بن جاتا ہے۔ جب اختر عثمان نظم کے آخری مصرعے میں یہ کہتا ہے کہ

"میں اپنی سنجو گتا کے ہمراہ ساعت سبز میں نئی نظم بن رہا ہوں"(۳۶)

نظم نوحہ گر میں فرضی کردار کے ذریعے مکالمہ کروایا گیا ہے لیکن نظم کے اختتام پر پہلی بار خود شاعر انسان کی بھیانک تاریخ بتاتے ہوئے پوری نسل انسانی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ قتل وغارت چھوڑ دو اس سے پہلے کہ نسل انسانی نابود ہو جائے۔

خون آدم کی تاریخ لکھتا رہا
ہر ورق پر لہو جھلملاتا رہا
میں قدیمی ہوں مجھ سے سنو(۳۷)

اگر اختراعی حوالے سے نظم کا جائزہ لیا جائے تو لفظ "قدیمی" جتنا صوتی اعتبار سے مجرد اور مکمل بیٹھا ہے اس سے دس گنا زیادہ مفہوم کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ خاور اعجاز نے تمثیل نظم اسلامی نظریے کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے. انسان کل سے بچھڑا ہوا جز ہے۔ ہماری یہ دنیا اس کی امتحان گاہ ہے اسے اس امتحان سے اس وقت تک حتمی نجات نہیں ملتی جب تک وہ اپنے وصل سے نہ جا ملے۔ تمثیل کا اختتام بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ واحد متکلم آنے والے آخری زمانے کی بات کرتا ہے جس طرح ہمارا عقیدہ ہے کہ ایک نہ ایک دن سب کچھ فنا ہو جائے گا اور انسان مرنے کے بعد اللہ کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ شاعر بھی نظم کے اختتام پر زمانے مراد اللہ تعالی کی طرف لوٹ جانے کی بات کرتا ہے۔ واحد متکلم اپنے رب سے ملنے کی آرزو میں چھے زمانے طے کر کے آیا ہے۔ اختتامیہ اقتباس ملاحظہ ہو:

زمانے!
پکارا ہے تو نے
تو میں آ رہا ہوں(۳۸)

حوالہ جات

1. اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۵ اپریل ۲۰۱۹ء، 4:00PM
2. اختر عثمان، تراش، رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۳۱
3. یوسف حسن، دیباچہ، تراش رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۷
4. شہزاد نیئر، گرہ کھلنے تک، الحمد پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۱
5. خاور اعجاز، تمثیل، شاخسار پبلیشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۶۵، ۶۶
6. سیف اللہ خالد، پروفیسر، پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، شفیق پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸۵
7. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۱۵
8. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۲
9. شہزاد نیئر، نوحہ گر، ایضاً، ص ۱۲۰
10. حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۱۹۸۵ء، ص ۳
11. مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم (حصہ چہارم)، الفصیل، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۵۶
12. یوسف حسن، دیباچہ، تراش رمیل ہاوس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲
13. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۷
14. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۴۸
15. شہزاد نیئر، راقمہ سے گفتگو، ۲۵ مارچ ۲۰۲۰ء، راولپنڈی
16. جلیل عالی، گرہ کھلنے تک کی فکری و شعری دھن، ادب لطیف، ماہنامہ، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۸۸
17. شہزاد نیئر، نوحہ گر، ایضاً، ص ۱۲۴
18. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۲
19. ایضاً، ص ۳۱
20. شہزاد نیئر، نوحہ گر، ایضاً، ص ۱۳۱
21. ایضاً، ص ۱۱۹
22. ایضاً، ص ۱۲۲، ۱۲۱
23. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۷
24. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۱۹

25. سیتہ پال آنند، دیباچہ، تمثیل، شاخسار پبلیشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء

26. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۵۹

27. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۲۹

28. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۲۶

29. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۳۵، ۳۲

30. ایضاً، ص ۲۹

31. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۳۱

32. ایضاً، ص ۲۹، ۲۸

33. ایضاً، ص ۴۱

34. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۳۴

35. ایضاً، ص ۲۶

36. اختر عثمان، تراش، ایضاً، ص ۳۸

37. شہزاد نیئر، نوحہ گر، ایضاً، ص ۱۴۰

38. خاور اعجاز، تمثیل، ایضاً، ص ۶۷

باب پنجم:

مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات

الف: مجموعی جائزہ

نظم ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی ایک موضوع پر مربوط طریقے سے اظہار خیال اور زندگی کی عکاسی اس طرح کی جاتی ہے کہ شاعر کے ذاتی تجربات، جذبات و احساسات اور انفرادیت واضح ہو جاتی ہے۔ نظم وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہوتی ہے جس میں جھول نہ ہو یہ کسی چیز کی طرح پہلے مصرعے سے آخری مصرعے تک لپٹی ہوئی ہو۔اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو باہمی طور پر آگے بڑھا رہا ہو گویا سارے حصے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔ جدید نظم نگاری اردو شاعری کا طاقتور اظہار ہے یہ جس کو خوبی اور مہارت کے ساتھ اس عہد کے انسان کو درپیش فکری مسائل کا احاطہ کر رہی ہے اس خوبی کے ساتھ شاید دیگر اصناف نہیں کر پا رہیں۔اس دور میں جن پیچیدگیوں کا ہمیں سامنا ہے اسے بیان کرنے کے لیے نظم جیسی صنف موزوں ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اردو نظم نگاری کی ایک مضبوط روایت ہمارے ہاں موجود تھی۔ انجمن پنجاب کی نظم نگاری کی کوششوں سے لے کر علامہ محمد اقبال تک اردو نظم نگاری مختلف ادوار اور حالات و واقعات سے گزرتی نظر آتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اردو نظم نگاروں نے ملک کے قومی اور بین الاقوامی مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ گہرے تہذیبی شعور، تخلیقی وقت، جدید طرز احساس، وسیع مشاہدے کے سبب اس صنف سخن کو عروج تک پہنچایا۔ ان میں ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور لسانی تشکیلات کی تحریک قابل ذکر ہیں۔انہی تحریکوں کے ذریعے شاعری نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔طویل نظم سنجیدگی اور غور و فکر کا تقاضا کرتی ہے۔اس میں خیال کو ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرنے کے لیے ایک طویل جنگل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جدید اردو شاعری میں طویل نظموں کا رجحان دراصل بڑی شے کو بڑے گھیرے میں متحرک کرنے کا رجحان ہے۔ دیگر اصناف کی طرح طویل نظموں کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ نوے کی دہائی کی جدید نظم کے پس منظر میں اردو نظم کی پوری روایت کھڑی تھی۔ نوے کی دہائی جدید نظم کے حوالے سے اہمیت کی حامل رہی۔ طویل نظموں کا نام آتے ہی ذہن میں ن م راشد، مجید امجد، وزیر آغا، آفتاب اقبال شمیم، علی محمد فرشی، اختر حسین جعفری کے نام فوراً جگمگانے لگتے ہیں۔ جدید نظم ذرا وسیع ترکینوس مہیا کرتی ہے۔ طویل نظم

زیادہ مہارت اور خوبی کے ساتھ مسائل کا احاطہ کرتی ہے لہذا جدید نظم کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اکیسویں صدی میں جو شعراء طویل نظم نگاری کے حوالے سے ابھر کر سامنے آئے ان میں نمایاں نام خاور اعجاز، اختر عثمان اور شہزاد نیئر کا ہے۔ انہوں نے واقعی یہ کام کیا ہے۔ ایک بہترین طویل نظم میں فلسفیانہ موضوعات کا بیان، بات کو وضاحت سے بیان کرنا اور تخلیقی زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ ساری باتیں جدید نظم کو اہم بناتی ہیں۔ ان سب کا بیان تینوں نظم نگاروں نے اپنی نظموں میں کیا ہے۔ زیر بحث تینوں نظمیں تراش، تمثیل اور نوحہ گر آزاد نظم کی ہئیت میں لکھی گئی ہیں۔ تینوں باشعور نظم نگاروں کی زیر بحث نظمیں معنوی اور فکری حصار میں قید ہیں۔ ان میں خیال کی تازگی اور جذبے کی ندرت موجود ہے۔ کسی بھی فن پارے کی تخلیق، تخلیق کار کی ذات اور شخصیت کی پرتیں کھولنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ اس کی قلبی واردات کا اظہار لفظوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اچھی شاعری کے لوازمات میں ایک بلند تخیل ضروری ہے۔ یہ تخیل ہی ہے جو نئے نئے تصورات کے جالے بنتا ہے۔ خاور اعجاز، اختر عثمان اور شہزاد نیئر کی نظموں میں بلند پردازی اور تخیل کی فراوانی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے آغاز آفرینش، تاریخی انسانی، کائنات کے اسرار، تصور زماں و مکاں اور فلسفیانہ افکار کا اظہار بڑی بصیرت سے کیا ہے۔ ان گہرے اور فلسفیانہ موضوعات پر قلم اٹھانا اور ٹھوس رائے دینا جان جوکھوں کا کام ہے۔ طویل نظم میرے خیال میں بہت بڑا کینوس ہے۔ یہ بہت بڑی سطح کی بات کرتی ہے اگر اس میں زمان و مکان، تاریخی فلسفہ، انسان کی حالت نفسیات کا بیان نہیں تو بڑی نظم بننے سے رہ جاتی ہے۔ طویل نظم میں انسان ایک بات کا آغاز کرتا ہے پھر اسے بڑے کینوس پر چلاتا چلا جاتا ہے۔ زیر بحث نظموں کا موضوع تاریخِ انسانی ہے۔ یہ آغاز آفرینش سے لے کر دور جدید تک کی تاریخ اور انسانی ارتقاء کا احاطہ کرتی ہیں۔ نظم تمثیل کا جائزہ لیا جائے تو ان میں آغاز آفرینش، تخلیق کائنات، تخلیق آدم، تاریخی واقعات، طاغوتی قوتیں، مذہبی تعلیمات ،تصور خدا، انسانی ارتقاء، تصور زماں و مکاں، رجائیت، نابودیت، تصور غم، تصور موت اور انسانی خواہشات کا تذکرہ جیسے موضوعات نظر آتے ہیں۔ نظم نوحہ گر کا جائزہ لیا جائے تو اس میں شاعر شہزاد نیئر آغاز آفرینش، تخلیق کائنات، تھیوریز کا تذکرہ، تاریخی واقعات، نوحہ گری، تصور خدا، انسانی ارتقاء، تصور وقت، رجائیت، نابودیت، تصور غم، تصور موت، قتل و غارت گری اور وجودیت جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اسی طرح نظم تراش میں تخلیق کائنات، تخلیق آدم، عظمت انسان، تاریخی واقعات، معاشرتی عدم مساوات، سرمایہ دارانہ نظام، انسانی ارتقاء، تصور زماں و مکاں، رجائیت، فرقہ واریت کی مخالفت، غارت گری، تصور موت، خطبہ حجتہ الوداع اور وجودیت جیسے موضوعات شامل ہیں۔ تینوں نظموں میں جاذبیت ہے ہر سطر قاری کو

دوسری سطر پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ان نظموں میں کہیں احساس نہیں ہوتا کہ شاعر کسی لفظ یا سطر کو قاری پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔یہ نظمیں فکری و فنی تقاضے پورے کرتے ہوئے قاری کو خود سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

آج کا انسان ہواوں، خلاوں، پانیوں اورزمینوں پر اپنی عقل و دانش کے بل بوتے پر حکمرانی کر رہا ہے۔اس نے کائنات کو تسخیر کر لیا ہے اور ساتھ ہی اپنی تباہی اور دکھوں کا سامان بھی پیدا کیا ہے۔زیر بحث نظمیں بتاتی ہیں کہ کیسے انسان نے انسانیت کی خدمت کی اور اس نے اپنے مفاد کے لیے زمین پر قدم رکھنے سے لے کر اب تک قتل و غارت گری کی۔ہمیشہ سے انسان انسان کا استحصال کرتا چلا آیا ہے۔تقابل بنیادی طور پر دو مشترک بنیاد رکھنے والی چیزوں کے موازنے کا نام ہے۔ہر دور میں تقابلی ادب کی اہمیت اور ضرورت رہی ہے۔تقابلی مطالعے سے دوادب پاروں کے درمیان اشتراکات اور افتراقات سے آگاہی ہوتی ہے۔مستقبل نامعلوم، ڈراؤنا، خوفناک اور مشتبہ ہوتا ہے کیونکہ آنے والا وقت انسان کی سوچ کے قطعی برعکس بھی ہو سکتا ہے۔یہ بھی عین ممکن ہے کہ آدم زاد نے آنے والے دس سال کی سوچ بچار کر رکھی ہو لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اگلے ہی پل وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے شاعر نے بہت خوب لکھا ہے

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک ساتھ تینوں زمانوں میں جیے۔جو معاشرے صرف ماضی میں جیتے ہیں وہ بے نام قبرستان کی ٹوٹی ہوئی قبروں کی مانند ہیں اور جو معاشرے صرف حال میں جیتے ہیں وہ ایسی لاشوں کی طرح ہیں جن کو ابھی دفنایا نہیں گیا اسی طرح تنہا مستقبل میں کوئی جی نہیں سکتا مگر کوئی صرف اس کی آرزو میں جیتا ہے تو مردہ جنین ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی ایک زمانے میں جینا سوائے عدم اور موت کے کچھ نہیں۔ماضی، حال اور مستقبل کی اہمیت بیان کرنے کے بعد اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نوحہ گر، تراش اور تمثیل تین الگ نظمیں ہونے کے باوجود ماضی اور تاریخ کے حوالے سے کیوں اشتراک رکھتی ہیں۔تینوں شعراء نے ایک وسیع اور گہرے موضوع انسانی تاریخ کو الگ الگ زاویے سے پرکھا ہے جس کی وجہ سے ان نظموں میں ہمیں اشتراکات اور افتراقات نظر آتے ہیں۔ یہ کائنات میں ہونے والی زمانی و مکانی تبدیلیوں کو نہ صرف

محسوس کرتے ہیں بلکہ ان کا کھوج بھی لگاتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں انہیں بیان کرتے ہیں۔ صوفیا نے بھی کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اپنی ذات کا سب سے بڑا ثبوت دیا۔ بقول اقبال

ع میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں

زیر موضوع نظموں میں نظم نگار اپنی ذات کے سمندر میں ڈوب کر حقیقت تک رسائی کے لیے اپنے تخیل اور تفکر کو استعمال کرتے ہیں۔ معاشرے میں پھیلے بگاڑ، انسانی ناروارویے اور گزرے وقت کے انمول لمحات کو مد نظر رکھتے ہوئے تینوں نظمیں لکھی گئی ہیں اس لیے ایک جیسی سوچ، فکر اور حالات ہونے کی وجہ سے ان کے موضوعات تاریخ انسانی، انسانی تہذیبی سفر، آغاز آفرینش، انسان کا ظہور، امن کی خواہش پر اختتام، رجائیت، فلسفیانہ نقطہ نظر، نوحہ گری، قدیم سے جدید تک کا مظاہرہ، تصور خدا، تصور وقت، انسانی تخلیقات کا تذکرہ، تصور موت اور فلسفہ وجودیت میں اشتراک پایا جاتا ہے۔

تینوں نظموں کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ کرنے سے جہاں ان میں اشتراکات پائے جاتے ہیں وہاں ان میں افتراقات بھی ہیں۔ تمثیل، تراش اور نوحہ گر کے موضوعات موقف، اختتامیہ، سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید، کردار نگاری، نابودیت، تخلیق کائنات، اسلوب اور ڈکشن میں فرق، مورخین پر تنقید، زمانے کی اہمیت، نظریہ مخویت، عالمی ادب کا حوالہ، مختلف حوالہ جات کا استعمال، مذہبی تعلیمات کا تذکرہ اور انسانی فرد کی آفاقیت کی شناخت میں افتراق پایا جاتا ہے۔

زیر بحث نظموں تمثیل، تراش اور نوحہ گر کے مطالعے اور تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو میں طویل نظم نگاری کا میلان عہد حاضر میں بھی پایا جاتا ہے اور شعراء اس سمت متوجہ ہیں۔ تمثیل، تراش اور نوحہ گر دور جدید کی بہتر اور برتر طویل نظمیں ہیں۔ بحثیت مجموعی تینوں نظمیں اپنے اندر مختلف قسم کے اشتراکات اور افتراقات کو لیے ہوئے ہیں جو انہیں ممتاز بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان نظموں نے انسان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان نظموں میں جدید علائم استعارات اور تمثال بڑی معنی خیز ہیں جو دعوت فکر کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ نظموں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ تینوں نظم نگاروں نے مشاہدے اور مطالعے پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہوئی ہے۔

ب: تحقیقی نتائج

معاصر نظمیں "تمثیل"، "تراش" اور "نوحہ گر" کے تجزیاتی اور تقابلی مطالعے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

1. زیر بحث نظموں کا دائرہ فکر انسانی تاریخ اور انسانی ذات ہے یعنی آغاز آفرینش سے لے کر اب تک انسانی بھیانک تاریخ اور انسانی جابرانہ فطرت کو بیان کرتی ہیں۔ یہ نظمیں فرضی کرداروں کی مدد سے اجتماعی آواز بن کر ساری انسانیت کو مخاطب کرتی ہیں اور معاشرے میں جنگ و جدل کی مخالفت کرتی ہیں۔
2. تین معاصر نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کے تجزیے سے ہمیں ان کے مختلف ذیلی موضوعات کا پتہ چلتا ہے۔ نظم "نوحہ گر" کے موضوعات میں آغاز آفرینش، انسانی قتل و غارت گری، انسان کا ظہور اور اس کے مہذب ہونے کے مدارج، انسانی تخلیقات کا تذکرہ، تصور وجودیت، نظریہ نابودیت، تصور غم، تصور خدا اور تاریخ کا مشاہداتی مظاہرہ شامل ہیں۔ نظم "تمثیل" کے موضوعات میں تخلیق کائنات، تخلیق آدم، مذہبی تعلیمات کا تذکرہ، طاغوتی قوتیں، تصور زماں و مکاں، تصور شکوہ، نوحہ گری اور انسانی خواہشات کا تذکرہ شامل ہیں۔ اسی طرح نظم "تراش" کے موضوعات میں عظمت انسانی، ، تصور وجودیت، معاشرتی عدم مساوات، ماحولیات کی تباہی، تاریخی واقعات کا تذکرہ، تخلیق کائنات اور مختلف مذاہب کا تذکرہ شامل ہیں۔ قاری کو نظم "تراش" کی مشکل پسندی اور نظم "نوحہ گر"، "تمثیل" کی طوالت کے باوجود کہیں پہ بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ نظم نگار بات کو ایک خاص انداز سے شروع کر کے نظم کے اختتام تک قاری کو اپنا پیغام بخوبی نشر کر دیتا ہے۔

3. تینوں نظمیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے شائع ہوئیں۔ یہ ایک ہی وسیع موضوع کو مختلف زاویوں سے بیان کرتی ہیں۔ جب ایک موضوع کو تین بڑے شعراء بیان کرتے ہیں تو ان میں مماثلت اور فرق بھی نظر آتا ہے کیونکہ نظم نگاروں کا زاویہ نظر مختلف ہوتا ہے۔

4. "نوحہ گر"، "تراش" اور "تمثیل" تین الگ شعراء کی نظمیں ہیں اور چونکہ تینوں شاعر دور جدید سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشرے میں پھیلی بگاڑ، انسانی ناروارویے گزرے وقت کے انمول لمحات کو مد نظر رکھتے ہوئے تینوں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اس لیے ایک جیسی سوچ، فکر اور حالات ہونے کی وجہ سے تینوں نظموں کے موضوعات کافی حد تک میل کھاتے ہیں۔ جن میں تاریخ انسانی، نوحہ گری، امن کی خواہش پر اختتام، انسان کا ظہور، تصور خدا، تصور وقت، تصور موت، تدریجی و تاریخی واقعات اور تصور وجودیت شامل ہیں۔

5. تینوں نظموں کے تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ تینوں نظمیں اعلیٰ درجے کی فکر اور فن اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں جہاں اشتراکات پائے جاتے ہیں وہاں افتراقات بھی نظر آتے ہیں۔ ان افتراقات میں تصور مخویت، تصور زماں و مکاں، اختتامیہ میں فرق، تھیوریز کا تذکرہ، مذہبی تعلیمات کا تذکرہ، انسانی خواہشات کا تذکرہ، فرد مولا صفات، مختلف حوالہ جات کا استعمال، نابودیت، سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید اور تخلیق کائنات شامل ہیں۔

6. تینوں نظمیں انسانی تہذیب کی اہم کروٹوں اور مختلف زمانوں میں انسان کا انسان کے ہاتھوں کیا گیا استحصال عمدگی سے آشکار کرتی ہیں۔ شعراء نے جہاں انسانی ارتقا، تہذیب، نت نئی تخلیقات، قتل و غارت، ماضی کی تلخ یادوں، تاریخی واقعات کو نئی نسل کے سامنے رکھا ہے وہاں تینوں نظم نگاروں نے نظموں کے اختتام پر دنیا میں قتل وغارت، بربادی کے خاتمے، امن اور شانتی کی زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہیں امید ہے کہ دنیا بربریت کی راہ سے ہٹ کر امن کی راہ اپنائے گی۔

7. تینوں نظموں کے اسلوب اور ڈکشن میں فرق ہے۔ "تراش" کو پڑھتے ہوئے قاری مشکل سے دوچار ہوتا ہے کیونکہ اس کا اسلوب قدیم طرز روایت کا ہے۔ "تراش" گنجلک، پیچیدہ اور مشکل نظم ہے۔ اس

میں فارسی اور ہندی لفظیات کی آمیزش ضرورت سے زیادہ ہے اور علامتی انداز قاری کے لیے مشکل پیش کیا گیا ہے۔ "تمثیل" کا اسلوب ن م راشد سے ملتا ہے اور علی محمد فرشی کی نظم "علینہ" سے قریب قریب نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود واقعات پر شاعر کی گرفت مضبوط ہے۔ "نوحہ گر" کا اسلوب جدید طرز بیانیے پر استوار ہے۔ اس میں کہانی اور واقعات کی ترتیب ایسی ہے کہ قاری اسے ایک افسانے کی طرح پڑھتا چلا جاتا ہے اور کہیں بھی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔

8. بڑا ادب اپنے تاریخی تناظر میں سماجی شعور اور انسانی قدروں کے حوالوں سے ہی بڑا ہوتا ہے۔ ان تینوں نظموں "تمثیل"، "تراش" اور "نوحہ گر" میں ہمیں ایسے خصائص نظر آتے ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نئی نسل کو ایک بڑے فکری پلیٹ فارم سے آگاہ کرنے کے لیے یہ تین نظمیں اہم ہیں۔

ج: سفارشات

ان نتائج کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

1. معاصر طویل نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کا فنی لحاظ سے تقابل پر مبنی تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔
2. معاصر طویل نظموں "نوحہ گر"، "تمثیل" اور "تراش" کا بیسوی صدی کی تین طویل نظموں سے تقابل پر مبنی تحقیقی کام ادب کے دامن کو مزید وسعت عطا کرے گا۔
3. نظریہ نابودیت کی روشنی میں ان تین طویل نظموں کا تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ پر تحقیقی کام اردو ادب میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہو سکتا ہے۔

کتابیات

الف: بنیادی مآخذ

اختر عثمان، تراش، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۸ء

خاور اعجاز، تمثیل، شاخسار پبلیشرز، راولپنڈی، ۲۰۱۵ء

شہزاد نئیر، گرہ کھلنے تک، الحمد پبلشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

ب: ثانوی مآخذ

کتب

احتشام علی، جدید اردو نظم میں عصری حسیت، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، س ن

اسٹیفن ڈبلیو ہاکنگ: (مترجم یاسر جواد) کائنات کی تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

اسٹیفن ہاکنگ: مترجم علیم احمد، کائنات کا مکمل ترین نظریہ، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۶ء

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۷ء

ایڈگر ایلن پو، باحوالہ مغرب کے تنقیدی اصول از سجاد باقر رضوی، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۳ء

توحید احمد، تقابلی ادب، ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جون، ۲۰۱۵ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، "ارسطو سے ایلیٹ تک"، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، اصنات ادب، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

حنیف کیفی، نظم معری اور آزاد نظم، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر، جدید تحریکات اور اقبال، حاجی حنیف پریس، لاہور، ۲۰۱۵ء

خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اردو نظم چند اہم جدید شاعر، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستان کی نئی نظم پر گفتگو، مشمولہ پاکستانی ادب، جلد اول، ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی، ۱۹۸۱ء

رفیع الدین ہاشمی، "اصناف ادب"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

روشن اختر کاظمی، ڈاکٹر، اردو میں طویل نظم کی روایت اور ارتقاء، ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

سرور جاوید، اردو نظم کی عظیم روایت، دنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، جولائی ۲۰۱۴ء

سعید، امتیاز احمد، اسلامی تہذیب و تمدن نیو بک پبلشرز، س ن

سیف اللہ خالد، پروفیسر، پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، شفیق پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء

شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

صادق علی گل، ڈاکٹر، سرگزشت تاریخ، پبلشرز ایمپوریم، لاہور، ۱۹۹۸ء

صفیہ عباد، رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری مطالعہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

صلاح الدین درویش، ڈاکٹر، انسان، کائنات اور سماج، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۱ء

طارق ہاشمی، اردو نظم اور معاصر انسان، پورب اکادمی، اسلام آباد، فروری ۲۰۱۵ء

عبد اللہ، شاہین، توحید، رسالت اور ولایت، فائن پبلشرز، لاہور، س ن

عزیز حامد مدنی، جدید اردو شاعری (حصہ دوم) انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۴ء

علی عباس جلال پوری، سید، کائنات اور انسان، تخلیقات پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء

عمران ازفر، نئی اردو نظم، نئی تخلیقی جہت، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۳ء

غلام جیلانی برق، ڈاکٹر، عظیم کائنات کا عظیم خدا، الفصیل ناشران و تاجر انکتب، لاہور، ۲۰۱۱ء

غیاث چوہدری، کائنات اور ہم، ٹیکنیکل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۴ء

فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو فسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

قاضی عبدالقدوس عرشی، "اصناف ادب اور علم بیان و بدیع"، مکتبہ عالیہ، لاہور، س ن

قمر رئیس، ڈاکٹر، ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء

کارل پوپر: مترجم ڈاکٹر ساجد علی، سائنس اور تہذیب، مشعل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء

کارل سارگان: مترجم منصور سعید، کائنات، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۱ء

محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر، نثری نظم، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۹ء

محمود علی سڈنی، ڈاکٹر، فلسفہ سائنس اور کائنات، الفصیل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۵ء

محمود علی، ڈاکٹر، کائنات اور اس کے مظاہر، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۶ء

مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم (حصہ چہارم)، الفصیل، لاہور، ۱۹۹۹ء

نعمان فاروق، غزل زندہ رہے گی، انحراف پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

نیاز احمد صوفی، ناتمام کائنات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء

نیاز فتح پوری، علامہ، خدا اور تصور خدا، فکشن ہاوس لاہور، ۲۰۱۲ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، سنگت پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء

وین برگ: مترجم ارشد رازی، سائنسی نظریہ تخلیق کائنات، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء

Encyclopedia Americana, vol_4 _Groleir incorporated dictionary

Connecticut , America 1982

ج: رسائل و جرائد

ادب لطیف، ماہنامہ، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۵ء

اوراق، لاہور، جلد ۱۹، شمارہ 3، 4 مارچ، اپریل ۱۹۸۴ء

سہ ماہی فن زاد، شمارہ ۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵ء، سرگودھا

نظم کائنات، ماہنامہ، کراچی، مارچ ۲۰۱۱ء

"نگار" پاکستان، جدید شاعری نمبر

د: اخبارات

مدثر راجہ، "روزنامہ ایکسپریس"، اسلام آباد، ۱۴ جنوری ۲۰۱۶ء

ہ: انٹرویو

اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۵ اپریل ۲۰۱۹، 4:00PM

اختر عثمان، راقمہ سے ملاقات، ماشااللہ ٹی ہاوس، اسلام آباد، ۱۶ نومبر ۲۰۱۹ء، 1:00 PM

افتخار عارف، تاثرات، ۲۹ مئی ۲۰۱۸ء

جواد ہمدانی کے تاثرات

خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۸ مارچ ۲۰۱۹، راولپنڈی

خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۱۸ مارچ ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

خاور اعجاز، راقمہ سے گفتگو، ۱۴ جنوری ۲۰۲۰ء، راولپنڈی

خورشید رضوی کے تاثرات

شہزاد نیئر، راقمہ سے گفتگو، ۱۵ جنوری ۲۰۱۹، راولپنڈی

شہزاد نیئر، راقمہ سے گفتگو، ۲۵ جنوری ۲۰۱۹، راولپنڈی

شمس الرحمان فاروقی، تاثرات، الہ آباد، دسمبر ۲۰۱۳ء

و: ویب گائیں (انٹرنیٹ ذرائع)

http//: www.facebook/khawer ijaz

www.humsub.com.pk

www.pal.gov.pk

www.urdulink.com

ضمیمہ جات

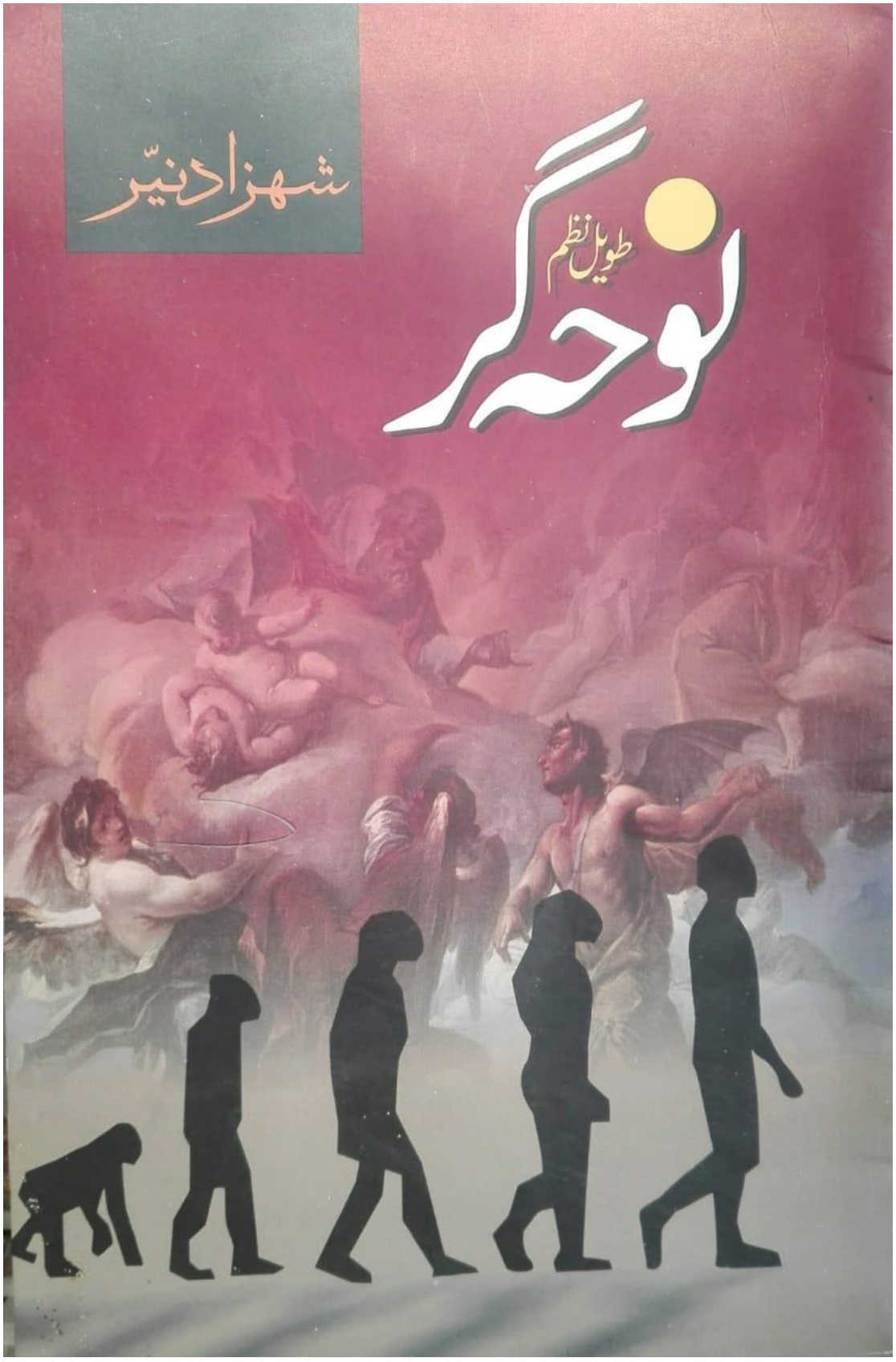

شہزاد نیّر
نوحہ گر
طویل نظم

تمثیل

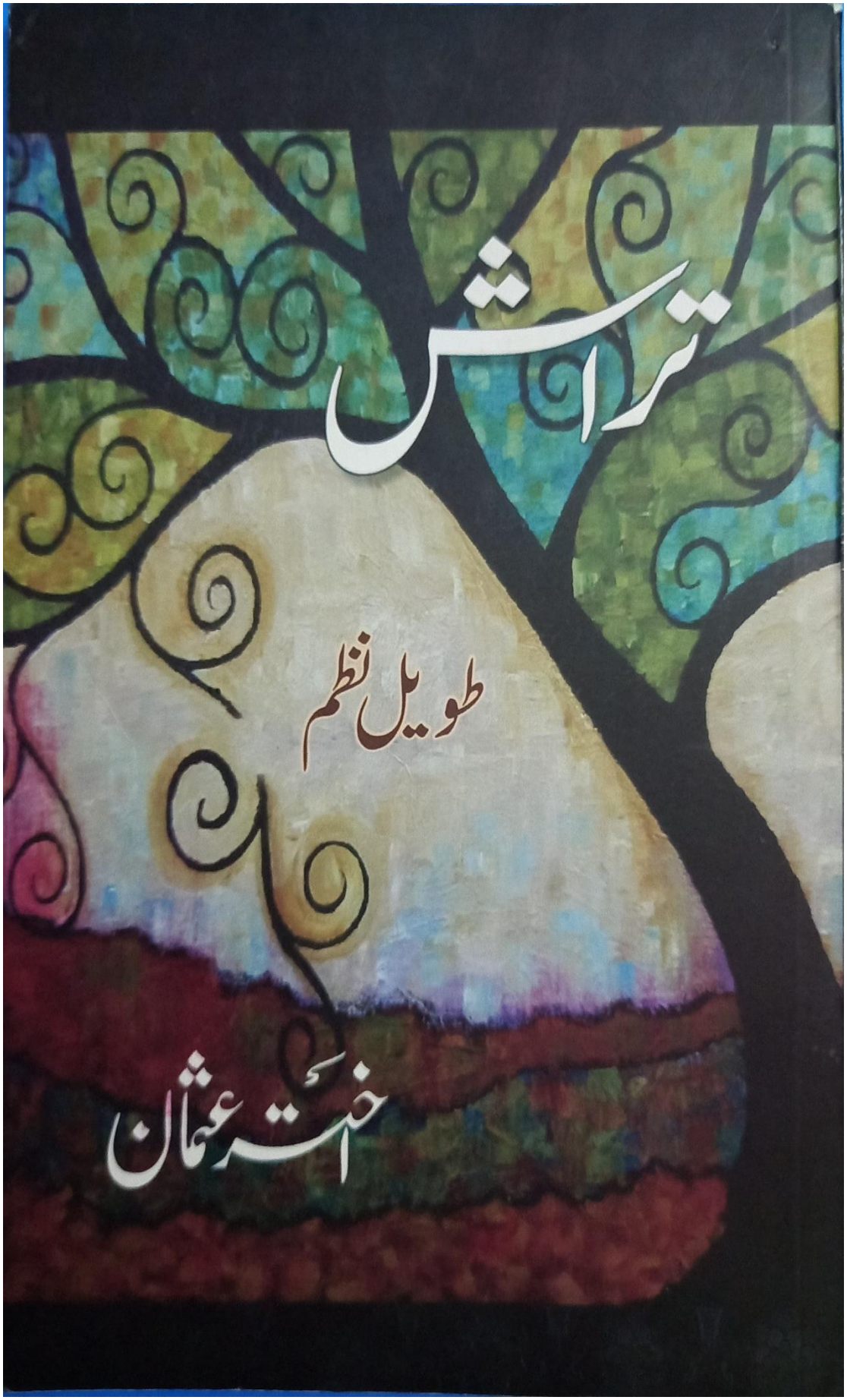
تراش
طویل نظم
اختر عثمان

National Language Promotion Department
National History & Literary Heritage Division (Government of Pakistan)
Ministry of Information, Broadcasting, National History and Literary Heritage
H.8/4, Pitras Bokhari Road, Islamabad (Pakistan)
Phone D.G. Office 9269751
PABX: 051-9269760, 9269761,9269762
Fax: 051-9269759
E.mail. iftikhararif@btinternet.com

ادارۂ فروغ قومی زبان
قومی تاریخ و ادبی ورثہ ڈویژن
وزارت اطلاعات، نشریات، قومی تاریخ و ادبی ورثہ، حکومت پاکستان
ایچ ۸/۴، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد (پاکستان)
فون دفتر ڈائریکٹر جنرل: ۹۲۶۹۷۵۱
پی اے بی ایکس: ۹۲۶۹۷۶۰، ۹۲۶۹۷۶۱، ۹۲۶۹۷۶۲-۰۵۱
فیکس: ۹۲۶۹۷۵۹-۰۵۱

۲۹/ مئی ۲۰۱۸ء

مختار صدیقی: 'موہنجوداڑو کی رقاصہ'، ن۔م۔ راشد: 'حسن کوزہ گر'، مجید امجد: 'نہ کوئی سلطنت غم'، اختر حسین جعفری: 'آئینہ خانہ'، سلیم احمد: 'مشرق'، ضیاء جالندھری کی نظم 'ہم'، جمیل الدین عالی: 'انسان' اور وزیر آغا کی نظم 'آدھی صدی کے بعد' کے تسلسل میں اختر عثمان کی طویل نظم "تراش" ہمارے عہد کی ایک بہت ہی پُر ماجرا تخلیق ہے۔ اختر عثمان جدید غزل اور نئے مرثیے میں اپنی تخلیقی ثروت مندی کے سبب ساری اردو دنیا میں تو پہچانے ہی جاتے ہیں پیشِ نظر نظم بلاشبہ جہان ادب سے ان کے شاعرانہ مقام و مرتبہ کے ازسرِ نو تعین کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوگی۔

کتاب پر یوسف حسن کے عالمانہ تعارفی مضمون سے نظم کو سمجھنے، پرکھنے اور لطف اندوز ہونے میں بہت مدد ملتی ہے۔ وقت کی تقویم میں عصر زماں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام اختر عثمان نے اس نظم میں ان ہی کم معلوم زمانوں کی جستجو کی ہے اور ان کی شناخت کے بعد ان کے آثار و رفتار کے حدود متعین کیے ہیں۔ بیسویں صدی کے انسان دوست، روشن خیال اور فکر انگیز نظریے پر یقین اور دنیا کو بدل دینے کی آرزو میں حرف کا صرف اختر عثمان کے ایمان شعری کا حصہ ہے۔ ان دنوں غزل کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ہمارے شعراء بہت کام کر رہے ہیں مگر بیشتر تحریریں تقلید و تکرار سے آگے نہیں جاتیں۔ مغرب کے ازکاررفتہ مضامین، اچھالے گئے تصورات اور نظریوں کو اپنی تفہیم ناقص کے مطابق نظم کر دینے سے شاعری کہاں وجود میں آتی ہے۔ دوسروں کے ہاں وقت اور ملک کے کاغذ کا زیاں ضرور ہوتا ہے۔ بیشتر شعری تحریریں دو سو سترہ (۲۱۷) الفاظ کے ذخیرہ لغت سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اختر کا لسانی سرمایہ حیرت انگیز اور قابل رشک ہے۔ اختر عثمان اردو دنیا کی کلاسیکی روایت میں جیسا درک رکھتا ہے ہمارے عہد میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ فارسی غزلیہ روایت کی نشاطیہ فضا کی سرشاری اور وفور قصیدے کی صلابت و شکوہ اور آہنگ مثنوی کا رواں اور شاداب بیانیہ اس کے تخلیقی وجود کا حصہ ہیں۔ ہندی کی مدھر تازگی اور مٹھاس اس کے شعری آہنگ میں ایک نئی طرح سے جادو جگاتی نظر آتی ہے۔ زبان کی اتنی طرفیں اور ایسی جہتیں کسی بھی ایک شاعر کے لیے مایہ امتیاز ٹھہرتی ہیں۔ پچھلے دو تین عشروں میں شائع ہونے والی طویل نظموں میں شاید ہی کوئی ایسی نظم ہوگی جو "تراش" کے سامنے ٹھہرتی ہو۔

میں "تراش" کی اشاعت پر اختر عثمان کو مبارک باد دیتا ہوں۔

(افتخار عارف)

جناب اختر عثمان کی خدمت میں
بصد ادب

تیرہ شبی میں مشعل حرف

اختر عثمان کی طویل نظم تراش، معاصر شعری روایت کی نمائندہ نہیں بلکہ ادب اور سماجی تاریخ کی جدلیاتی سانچے میں تخلیقی تراشکاری ہے۔ یہ طویل نظم یا مختصر کتاب انسانی تاریخ کے ماضی کی ساعت صفر سے شروع ہوتی ہے اور انسانی سماج کے پیچ در پیچ اور پر فراز و نشیب سفر کی منظوم قصہ گوئی کرتے ہوئے مستقبل کی ساعت سبز میں جا اترتی ہے۔

نظم کے بعض آزاد اور بعض پابند حصے انسانی آزادی اور غلامی کا قصہ اس قدر خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری تاریخ آدمی کی عظیم وحشت کو بھول کر شاعر کی سخن طرازی اور غنا نوازی کی داد دینے لگتا ہے۔ تراش میں مانی اور اینجلو، انیس اور فردوسی انسانی تہذیب کا مشترکہ ہمالیاتی سرمایہ اور ارسطو و مارکس اور سینا و سائن مشترکہ جدلیاتی اثاثہ ہیں۔ تراش اس لئے کبھی معرب اور کبھی مفرس، کبھی ہندی انگ اور کبھی مغربی رنگ رنگی جاتی ہے کہ اپنے قاری کو پیغام دے سکے کہ اگرچہ انسان زبانوں، علاقوں، فلسفوں اور نظریوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن سب انسانیت کی کتاب کے متن گراں بہا کا حصہ ہیں۔

نظم کے کبھی طویل اور کبھی مختصر ہوتے ہوئے مصرعے اس سماجی ناہمآہنگی اور معاشرتی عدم مساوات کا بیان بھی ہیں جو معلوم تاریخ سے نامعلوم زمانے تک پھیل رہی ہے:

وہ زہر آلود قہقہے بھی جو برتری کی سرانڈھ سے باغ زیست کی باس کھا رہے ہیں
وہ سات سو اور یہ سات ارب ہیں
یہ سات ارب اپنی نارسائی پہ سرد آہیں بھرنے والے
تمام ناکردہ کار، تقدیر محض کی تہ میں مرنے والے
خدا پہ الزام دھرنے والے
تمام گنگ اور تمام کر ہیں

تراش ان امن پسند حروف کی صدا بھی ہے جو بھاری بھرکم پر شکوہ مصرعوں کے جبر و کبر میں گھر کر بھی انسانیت کے پوشیدہ لیکن گویا ضمیر کے سے ہیں۔ وہ لوگ جو حرف کن کی طرح کائنات پر بھاری ہیں۔

تراش انسانوں کی آبادی سے زمیں کی بربادی کا نوحہ بھی ہے جو سینہ سنگ سے بھی پھوٹتا ہے اور منقار طیور سے بھی۔ لیکن اس تمام کرب میں انسان کے وجود کی مرکزیت کہیں ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کائناتی جدلیاتی عمل میں انسان کا اپنا حصہ ہے اور انسانی وجود سے رونما ہونے والی بربادی اور آبادی کے بغیر داستان ہستی ادھوری اور ناتمام ہے۔ جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے، خوف اور بے چینی، امید اور مسرت میں بدلتی جاتی ہیں اور وحشت اور بربریت کے پس پردہ نگار صبح عظیم غرقے کی اوٹ میں دھرتی کی رات پر آفتاب امید بن کر اترنے کا منتظر دکھائی دیتا ہے۔

جواد ہمدانی

شہزاد نیّر کی طویل نظم 'نوحہ گر' ان کے اندر رچے بسے تاریخی اور عصری شعور کا باکمال شاعرانہ اظہار ہے جس میں انہوں نے کمال مہارت سے 'بے قید' وقت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ سچ کہوں تو شہزاد نے سائنس کو رومانس بنا دیا ہے اور اردو زبان کی کم مائیگی کے باوصف یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔

یہ نظم کہانی ہے نیستی سے ہستی ہونے کی اور پھر اس ہستی کے بستی بسانے کی، خوف کی زمین سے دیوتاؤں کی فصل اگانے کی اور دیوتاؤں کو ایک خدا میں سمانے کی اور پھر آباد بستیوں کو مذہب کے نام پر برباد کرنے کی۔ یہ المیہ ہے زمین و زمان کا جس کی جڑیں ہم آج بھی آسمان میں ڈھونڈنے پر تُلے ہیں۔ آسمان۔۔۔ کہ جو محض آنکھ کا گمان تھا اسے مقدس صحائف نے 'یقینی بیان' کے مقام پر براجمان کیا مگر اب تصورِ فلک علمی تحقیق کے میدان میں 'بے امان' ہے۔ !

یہ نظم محض ادب کا چسکہ رکھنے والوں کی بجائے ادب کے سنجیدہ قارئین سے مکالمہ کرتی ہے۔ 'نوحہ گر' اپنے اسلوب اور خاص طور پر نفسِ مضمون کے لحاظ سے ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

سعید ابراہیم

3-اگست 2010ء لاہور

'تراش' اختر عثمان کی طویل نظم کتابی صورت میں

ہمارے ہاں طویل نظم کا اب رواج نہیں رہا، اس لیے ماضی قریب تک میں کوئی مثنوی وغیرہ تخلیق نہیں کی گئی۔ آخری طویل نظم جو بے حد مقبول ہوئی اور طوالت کے باوجود بعض لوگوں کو زبانی یاد بھی تھی۔ وہ علامہ اقبال کی شکوہ جواب شکوہ تھی۔ طویل مختصر نظمیں البتہ ضرور لکھی گئی ہیں۔ طویل نظم کی گنجائش شاید اب اس لیے بھی نہیں ہے کہ لوگوں کے پاس شعر و ادب کے لیے اب وقت ہی نہیں رہا ہے اور قاری کا رجحان اختصار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ غزل کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا شعر جو بجائے خود دو مصرعوں کی نظم ہوتا ہے' اپنے اختصار و اعجاز کی وجہ سے ابھی تک زندہ چلی آ رہی ہے' جبکہ مختصر نظم اپنے اختصار کی بناء پر بھی مقبول ہے' جس ضمن میں علی محمد فرشی کی مختصر نظموں کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے؛ چنانچہ جو فرق یعنی ایجر اور میورل میں ہے' وہی مختصر اور طویل نظم میں بھی ہے۔ اور یہ شاعر کے وفور اور ہمت پر منحصر ہے کہ وہ طویل نظم پر ہاتھ ڈال سکے' نیز شاعر کے ذہن و دل میں جو حشر بپا ہوتا ہے' وہی طویل نظم کا جواز بھی بنتا ہے۔

یہ کتاب رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز' راولپنڈی نے چھاپی ہے' جس کا گٹ اپ بطور خاص عمدہ ہے اور اس کی قیمت 180 روپے رکھی گئی ہے۔ سرورق منظر رقم اور محمد مختار علی کے موقلم کا نتیجہ ہے' جبکہ تزئین قمر الزمان کی ہے۔ انتساب استاد گرامی ڈاکٹر احسان اکبر اور منظر نقوی کے نام ہے۔ پس سرورق شاعر کی دیگر مطبوعات کی تفصیل ہے اور تصویر۔ کتاب کا دیباچہ ممتاز ادیب یوسف حسن کا تحریر کردہ ہے' جس میں وہ لکھتے ہیں: ''نظم کا موضوع فطری ماحول میں نوع انسانی کی اپنی بقا اور نشوونما کے لیے سماجی جدوجہد ہے اور اس نشوونما کے انسانیت نواز امکانات کو حقیقت پذیر کرنے کی فکری و عملی مسائل کی ترجمانی مختلف کینٹوز میں مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے۔ سماجی فرد کے جس تصور کو اس نے اپنایا ہے' موضوع کے مواد میں اس کی مطابقت کا کتنا خیال رکھا گیا ہے۔ اس پر بعض نکات کے حوالے سے کچھ سوالات کیے جا سکتے ہیں۔ اختر عثمان نے اپنے مواد موضوع کو جس آئیڈیالوجیکل مؤقف سے پیش کیا ہے' وہ ترقی پسندوں کا معروف آفاقی مؤقف ہے۔ اسے اپنے مؤقف کی صداقت اور قوت پر کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس مؤقف کا خلاصہ اس نے دو الگ الگ کینٹوز میں بیان کر دیا ہے۔ ایک کینٹو میں اجتماعی امکانات اور خواب ہیں۔ اور دوسرے میں واحد متکلم نوع انسانی کے ترجمان کی حیثیت سے اپنا اثبات کرتا ہے۔ اجتماعی حوالے کے لیے آٹھویں کینٹو کا آخری حصہ دیکھیے:

''ہم ایک ہیں سب
سیاہ' سفید ایک ہیں
کسی کو کسی پہ کچھ برتری نہیں ہے

نہیں ہے۔ اس موقف کا خلاصہ اس نے دو الگ الگ کینٹوز میں بیان کر دیا ہے۔ ایک کینٹو میں اجتماعی امکانات اور خواب ہیں۔ اور دوسرے میں واحد متکلم نوعِ انسانی کے ترجمان کی حیثیت سے اپنا اثبات کرتا ہے۔ اجتماعی حوالے کے لیے آٹھویں کینٹو کا آخری حصہ دیکھیے:

''ہم ایک ہیں سب
سیاہ' سفید ایک ہیں
کسی کو کسی پہ کچھ برتری نہیں ہے
سوائے تقویٰ' بجز نکوخوئی کوئی بھی برتری نہیں ہے''
اگر کوئی گنگ اور کر ہے تو موج ہائے صدائے تابندہ دیکھ سکتا ہے
بے بصر ہے تو خود سے پوچھے

اور نوعِ انسانی کے نمائندہ فرد کی ترجمانی اسی کی زبانی بارہویں کینٹو کے گیارہ ہم قافیہ و ہم ردیف مصرعوں میں ہے' جس کے آخری مصرعے یہ ہیں:

میں زمرۂ کائنات میں سرفراز بھی ہوں
میں آدمیت کے واسطے اعتزاز بھی ہوں
میں تاج و تخت و کلاہ سے بے نیاز بھی ہوں
میں فردِ مولا صفات' بندہ نواز بھی ہوں....!

ہماری شعری تنقید میں اوزان کی بحثیں بہت ہیں' لیکن آہنگ یا ردھم کو کہیں برائے نام ہی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ آہنگ کے حوالے سے دیکھا جائے' تو اس نظم کا ایک تو معنوی آہنگ ہے' جو نظم کے موضوعاتی پہلوؤں کے تنوع سے گزرتے ہوئے ساری ساختوں کو ایک ایسے کل میں ڈھالتا ہے' جو بند کل نہیں ہے' بلکہ اس کل کی تکمیل اصل میں ایک نئے سماجی اور شعری تخلیقی آغاز کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب وہ آخری مصرعے میں یہ کہتا ہے کہ:

میں اپنی سنجوگتا کے ہمراہ ساعتِ سبز میں نئی نظم بُن رہا ہوں

تو یہ نظم بُننے کا تخلیقی پروسیس' نئے جہاں کی تخلیق کا بھی استعارہ بن جاتا ہے...

اختر عثمان اپنی اس نظم میں اپنے ہم عمر شاعروں سے بہت آگے چلا ہے اور جہاں سازِ ترقی پسند شعری روایت کو اس نے فکری اور فنی و جمالیاتی' ساری جہات میں نمو پذیر جلا بخشی ہے۔

اور اب آخر میں اس ہفتے کی تازہ غزل:

ستم و ظلم کا نشاں بھی ہے
یہ زمیں تھوڑی آسماں بھی ہے
اس کی محنت ہے دوگنا کہ یہ شخص
راہزن بھی ہے' پاسباں بھی ہے
درمیاں میں ٹھہر بھی جاتا ہوں
یوں طبیعت مری رواں بھی ہے
کچھ حقیقت بھی ہے کہانی میں
اور کچھ زیبِ داستاں بھی ہے

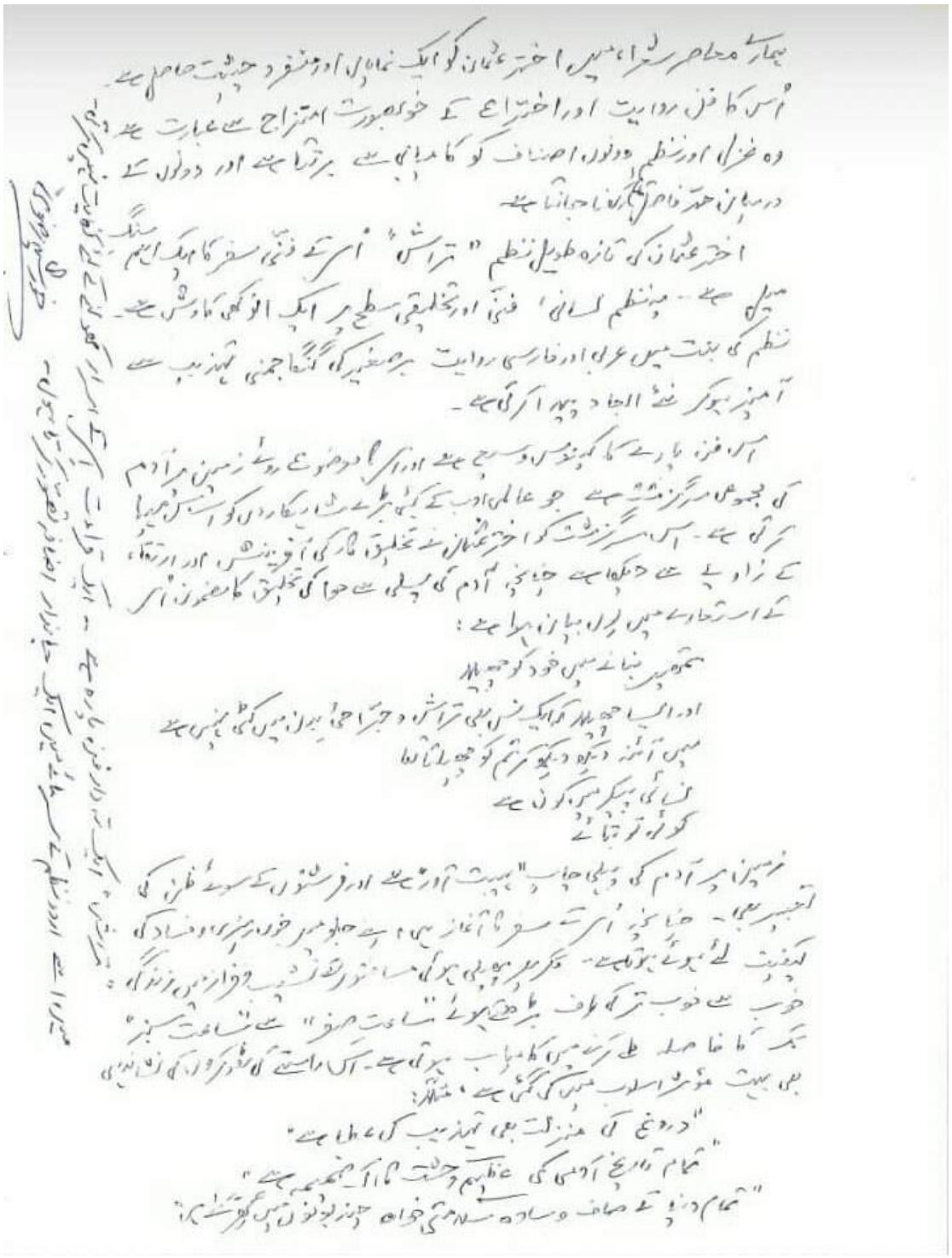

اختر عثمان کی ایک نظم

شمس الرحمٰن فاروقی

اختر عثمان کا مجموعۂ کلام مجھے کچھ دن ہوئے علی اکبر ناطق نے بھیجا تھا۔ میں نے اسے ادھر ادھر سے دیکھا تو دل متوجہ ہوا۔ لیکن شروع کی چند نظموں میں ہندی کا وفور دیکھ کر میری دلچسپی کچھ کم ہو گئی۔ میں نے کتاب رکھ دی کہ فرصت سے دیکھوں گا۔ مجھے ہندی، یا کسی اور زبان سے کوئی کد نہیں۔ بلکہ میں تو ہمیشہ کہتا اور لکھتا رہاہوں کہ شاعر کو حق ہے کہ اداے مطلب کے لئے اسے مروج زبان میں لفظ نہ ملے تو وہ پرانی زبان استعمال کر لے اور اگر وہاں کامیابی نہ ہو تو کسی قریبی زبان کا لفظ برت لے۔ ظاہر ہے کہ اس اصول میں ہندی ، پنجابی، سبھی شامل ہیں۔ لیکن آج کل ایک رجحان یہ چل پڑا ہے کہ اچھے خاصے سبک، سجل اور مروج اردو لفظ کو چھوڑ کر ہندی کے الفاظ استعمال کئے جا رہے ہیں اور وہ بھی ایسے، جو نامانوس بلکہ ناگوار ہیں۔

خیر ، علی اکبر ناطق کا تقاضا بڑھا تو میں نے کتاب تلاش کرنی شروع کی۔ لیکن میرے یہاں کسی کتاب کا مل جانا، اگر اسے آئے ہوئے کچھ مدت ہو گئی ہو، بہت ہی مشکل ہے۔ وقت اور طاقت اور جگہ کی کمی سبھی مانع ہیں۔ مجبوراً میں نے ناطق سے کہا کہ بھائی ، اختر عثمان کا کچھ کلام دوبارہ بھجوا دوں تو میں پڑھ کر دیکھوں، کیوں کہ مجھے ان کی کتاب کی وصولی اور اس کے بار ے میں میری اچھی لیکن مشروط رائے بھی یاد ہے۔ اب انھوں نے مجھے اختر عثمان کی ایک نسبۃً طویل نظم ’تراش‘ بھیج ہے اور میں اسے پڑھ کر

حیرت زدہ رہ گیا ہوں۔
کیا اس زمانے میں الفاظ پر یہ قابو، آہنگ میں یہ تنوع، بحور اور اوضاع شعر پر یہ اختیار ممکن ہے؟ اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ اس بات کا کیا امکان ہے کہ شاعر کا لہجہ گمبھیر اور دلنواز ہو، اس کے کلام میں تفکر کی گہرائی ہو، لیکن یہ تفکر ہمارے زمانے کی سرسری اور ریڈیو،ٹی وی پر صبح سے شام تک ہمارے کانوں میں فضولیات کا سیلاب بہانے والی باتوں پر نہ ہو،بلکہ خود شاعر کے داخلی تجربات اور اپنے بارے میں چھان بین پر مبنی ہو؟میں کہہ سکتا ہوں کہ ہاں، اس کے باوجود شاعر کا لہجہ کہیں خطیبانہ، کہیں پیغمبرانہ ہو تو نظم اپنی جگہ پر شاہکاربن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔
’تراش‘ کا ذیلی عنوان،یا انتساب کسی سنجوگتا کے نام ہے اور بظاہریہ کوئی خیالی ہستی ہے کیونکہ نظم کا دوسرا ہی مصرع کہہ رہا ہےع
میں اپنی سنجوگتا کے ہمراہ ساعت صفر میں سب الفاظ سن رہا ہوں
’ساعت صفر‘سے بظاہر کوئی خیالی وقت یا وقفہ مراد ہے ، کیونکہ متکلم جن الفاظ کو سن رہا ہے وہ سکوت سے پیدا ہوا ہے۔ نظم کا یہ پہلا حصہ سارے کا سارے ہم قافیہ ہے ۔ لیکن ردیف میں ایک دلچسپ تجربہ یہ کیا گیا ہے کہ ایک مصرعے کی ردیف’رہی ہیں‘ اور اگلے مصرعے کی ردیف ’رہا ہوں‘ہے۔کوئی کچھ کہہ رہا ہے، یا نہیں کہہ رہا ہے لیکن دو کردار ہیں، ایک شاید سنجوگتا ہے، یا ’سکوت‘ ہے جو نظم کا پہلا لفظ ہے۔ ان آٹھ مصرعوں کی قوت نئے الفاظ اور متکلم کی آواز میں ہے جس میں انفعال کہیں بھی نہیں، حالانکہ بات کسی

مدافعانہ صورت حال کی بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ متکلم کسی 'تمثیل' کی بات کرتا ہے جس میں وہ 'تہی از سخن' رہا ہے۔یہ 'تہی از سخن ' بھی کیا لذیذ ترکیب ہے۔

دوسرے حصے میں منظر بدلتا ہے لیکن کردار وہی ہیں۔ منظر میں پہاڑ ہیں جو 'گنگ اور ازل سے کر ہیں'۔ ممکن ہے یہ خاموشیوں کے پہاڑ ہوں، ممکن ہے یہ زندگی کی بے مروتی اور بے حسی کے پہاڑ ہوں۔کیونکہ یہ پہاڑ خود گونگے اور بہرے ہی نہیں ہیں، جو آواز ان تک پہنچتی ہے وہ واپس آکر متکلم ہی کے کانوں سے ٹکراتی ہے، بلکہ یہ پہاڑ متکلم کی صدا اور سخن کو اٹھا کر پھر اسی کے 'منھ پہ مارتے ہیں'۔

میں ڈرتا ہوں کہ تجزیے اور اظہار خیال کا یہ انداز اختیار کئے رہوں گا تو میری تحریر نظم سے بھی بہت طویل ہو جائے گی، حالانکہ خود نظم کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے اب میں ان چند حصوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو مجھے آج کی شاعری میں بے مثال لگتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ بعض جگہ زور کلام کے باوجود نظم پر سے ابہام کے پردے اٹھے ہوئے نظر آتے ہیں اور لہجے کی پیغمبرانہ شان کے باوجود مجھے مطمئن نہیں کرتے، کیونکہ مجھے سہل اور سرسری حل متاثر نہیں کرتے۔متکلم کی آواز سنجوگتا کو کچھ تعلیم دینا چاہتی ہے، لیکن ایسی تعلیم مجھے متاثر نہیں کرتی جس میں عمومی ہی باتیں ہوں۔ مثلاً:

یہ سات ارب اپنی نارسائی پہ سرد سرد آہیں بھرنے والے
تمام ناکردہ کار تقدیر محض کی تہ میں مرنے والے
خدا پہ الزام دھرنے والے
تمام گنگ اور تمام کر ہیں

مصرعوں کی روانی کے باوجود 'سر د سرد آہیں' جیسا تکراری فقرہ شاعر کی طبیعت میں کچھ عجلت پسندی کا غماز معلوم ہوتا ہے۔ اور جہاں تک سوال حل کا ہے، تو ہم سات ارب لوگ اگر ہر جگہ مار کھا رہے ہیں اور عالم کاروں کا شکار ہونے پر مجبور ہیں تو ہمیں یہ کہہ کر بر خاست نہیں کیا جانا چاہیئے کہ ہم خدا پر الزام دھر کر اپنے جرم سے بری ہونا چاہتے ہیں۔لیکن متکلم کی فکر فوراً ہی کسی اور طرف منتقل ہوتی ہے۔ وہی بات جو میں نے اوپر کہی، اسے وہ انتہائی پر قوت اور تاریخ کے احساس سے لبالب مصرعوں میں کہتا ہے۔ زور کلام اس قدر ہے کہ زیادہ تر مصرعے فارسی ہیں لیکن کسی قسم کے تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ قافیے کا التزام یہاں بھی ہے:

ہر آنکہ مونس شمردم آخر براہ آمدپئے گزندے ضرر پسندے
گہے ز باغے گیاہ خوردم گہے بہ خاکے تہ سمندے ستم کشندے
بہ پیش گرگان دہر بودم برآب جوے چو گوسفندے اسیر بندے

دوسرے مصرعے میں 'ستم کشندہ' کو ایرانی لہجے

دوسرے مصرعے میں ’ستم کشندہ‘ کو ایرانی لہجے میں ’ستم کشندے‘لکھا لیکن قافیے کی صورت کی خاطر املا بدل دیا۔ اسے جدت بھی کہہ سکتے ہیں اور زیادتی بھی۔ لیکن اردو نظم میں فارسی اشعار کو ایرانی املا کے ساتھ لکھنا مجھے بالکل اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں اپنے ملک کے فارسی داناں سے احتجاج کرتا رہتا ہوں لیکن وہ نہیں سنتے، ’ہر‘ کو ’ھر‘ اور ’گہے‘ کو ’گھی‘ اور ’باغے‘ کو ’باغی‘ بنانے سے نہیں تھکتے۔ اختر عثمان سے میری درخواست ہے کہ اردو کے املے پر فارسی کی یلغار نہ کریں، خواہ ان کے مصرعے فارسی ہی کے کیوں نہ ہوں، لیکن ہیں تو وہ اردو نظم کا حصہ۔

آگے چل کر متکلم اپنا رجز گاتا ہے، اور حق یہ ہے کہ خوب گاتا ہے۔ لہجے میں تیقن یہاں بہت سج رہا ہے۔ ایک ہی قافیے اور ردیف کا التزام ہر مصرعے میں ہے جس سے پیغمبرانہ شان پیدا ہو جاتی ہے:

میں آدمیت کے واسطے اعتزاز تھا ہوں
میںہر زمانے کا مقصدو ارتکاز تھا ہوں
میں تاج و تخت و کلاہ سے بے نیاز تھا ہوں
میں فرد مولا صفات بندہ نواز تھا ہوں

اس کے پہلے (یہ حصہ ، یا بند، نمبر ۱۲ ہے)انسان کی ازلی صورتوںپر، اور انسان پر گذرنے والے ستم اور ظلم بے نہایت کا ذکر ، اور انسان کے غرور اور کبر کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہاں بھی الفاظ میں ایک شان پیمبرانہ ہے،

ہر چند کہ مضامین کی تکرار ہے۔ لیکن یہ بحر ذخار ہے، اس کی تکرار میں بھی ایک لطف ہے کیوں کہ ہر موج دوسری سے کچھ مختلف بھی ہوتی ہے۔لیکن نظم کے ختم ہونے پر ایک کمزوری کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ترقی پسند صاحبان ہر نظم میں کسی نہ کسی نہج سے آنے والی صبح کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ ان کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ جس صبح کی بشارت دی جارہی ہے وہ آکیوں نہیں چکتی، اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ صرف خو ن صد ہزار انجم پر رک نہ جائے گی، بلکہ آہی جائے گی؟ مارکس نے اگر مذہب کو عوام کی افیون کہا تھا تو یہ بھی افیون ہی تھی، خواہ اس کا محاور ہ مختلف ہو۔

اختر عثمان کی نظم بھی مجھے ذرا مایوس کرتی ہے کہ اس میں جو حل پیش کیا گیا ہے وہ افیونی ہی قسم کا حل ہے:

یہ مصحف صبح کا وظیفہ ہی کن کا پہلا اور آخری گام ہے
خیالات ہیں پڑا ؤ
سو چہرۂ صبح کا الاؤ ہی شب زدوں کی قیام گہ ہے

نظم ان مصرعو ں سے شروع ہوئی تھی:

سکوت.....فردا وی کے سونے سمے میں بھولی لویں بیانات بن رہی ہیں
میں اپنی سنجوگتا کے ہمراہ ساعت صفر میں سب الفاظ سن رہا ہوں

اور آخری مصرعے ہیں:

کلام ..... فردا ودی کے شیتل سمے میں ہنستی لویں
کمالات سن رہی ہیں
میں اپنی سنجوگتا کے ساتھ ساعت صفر میں نئی نظم
بن رہا ہوں

سبحان اللہ ، کس قدر پر قوت دائرہ ہے، اور کلام (نظم)
کو ہر چیز کا جواب قراردےنے میں جو لطف ہے وہ
میرے لئے تو بیان سے باہر ہے۔ لیکن فیض صاحب کی
نظم پیچھا نہیں چھوڑتی، شاعر کا، اس لئے وہ ابھی
فیض صاحب ہی طرح ناپختہ منزل میں ہے، اور میرا،
کہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے:
یقیں جو غم سے عظیم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

مگرخدا کی قسم کس قدر مزیدار چھا چھ ہے۔ بس یہ
ہے کہ گوالے صاحب ذرا زیادہ محنت کریں تو خالص
گھی بھی نکال لائیں گے۔

شمس الرحمٰن فاروقی
الٰہ آباد، دسمبر ۲۰۱۳